اسلام یہ ہے

علامہ محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ







ترجمہ

ابو مسعود اظہر ندوی



اسلام یہ ہے

علامہ محمد غزالیؒ

ترجمہ

ابو مسعود اظہر ندوی

مکتبۃ قاسم العلوم

نام کتاب اسلام یہ ہے

نام مؤلف علامہ محمد غزالی

ترجمہ ابومسعود اظہر ندوی

اہتمام ملک اسد علی قاسمی

مطبع نوید حفیظ پریس

سن اشاعت 2016

ناشر مکتبہ قاسم العلوم

ڈسٹری بیوٹر

ملک اینڈ کمپنی

رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

042-37248209-37231119

انتساب

ہُدیٰ ایجوکیشنل سوسائٹی جگدیشپور ضلع سلطانپور یوپی
کے سربراہ

ڈاکٹر اطہر ریحان

کے نام

جو جہالت کی تاریکیوں میں علم کی شمع جلانے کی
سعیِ مشکور کر رہے ہیں۔

"ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ"

ابو مسعود اظہر ندوی

فہرستِ ابواب

۳۔ ایمان وعبادات

۴۔ بامقصد معاشرہ

۵۔ اسلامی شریعت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مترجم

چالیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف علامہ محمد غزالی عالمِ اسلام کے ممتاز صاحبِ قلم ہیں۔ جدید اسلوب میں اسلام کی بہترین ترجمانی اور اسلام کے بارے میں پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں ان کی شخصیت کافی شہرت رکھتی ہے۔ یہ کتاب "اسلام یہ ہے"، جو مصنف کی مایہ ناز کتاب "ھٰذا دیننا" کا ترجمہ ہے۔ ایک ایسا صاف وشفاف آئینہ ہے جس میں اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات کی سچی تصویر اپنی آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ علامہ غزالی دعوت وتصنیف کے میدان میں تقریباً نصف صدی سے سرگرم عمل ہیں اور انھوں نے گہرائی کے ساتھ اسلامی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں اور ان سے متعلق پائی جانے والی بے بنیاد خام خیالیوں اور غلط فہمیوں کا پوری بیدار مغزی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب میں اسی مطالعہ کا نچوڑ، مختصر مگر جامع و واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

کتاب عقائد، عبادات، اسلامی شریعت اور ان سے متعلق متعدد ضروری ابواب پر مشتمل ہے جن کے تحت پورے دین کے اہم پہلوؤں اور گوشوں کی دلنشیں انداز میں وضاحت کی گئی ہے۔ پوری بحث کا انحصار قرآن کریم، احادیثِ نبویہ نیز ائمہ وفقہائے کرام کے افادات پر ہے جن کے ذریعہ دین سے متعلق بہت سی خام خیالیوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو اردو داں حضرات کے لیے بھی استفادۂ عام کا ذریعہ بنائے۔ واللہ الموفق وھو المستعان

ابومسعود اظہر ندوی

پیش لفظ

مجھ سے ایک بڑے ذمے دار نے فرمائش کی تھی کہ ایک ایسی کتاب تیار کروں جس میں عصرِ حاضر کے اسلوب کے مطابق اسلامی تعلیمات کے سارے حقائق آجائیں مگر مشکل و دقیق اصطلاحوں کی بھرمار نہ ہو۔ یہ کتاب جامع ہونے کے ساتھ ساتھ مختصر مگر بالکل واضح ہونی چاہیے تاکہ اگر کوئی ایسا شخص بھی، جو اسلام کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا ہو، اسے پڑھے تو اس کے سامنے پوری تصویر آجائے اور وہ اس دین کے بارے میں سب کچھ جان لے۔

میں نے یہ فرمائش قبول کرلی تو اسے عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ میں نے بہت سے اسلامی موضوعات پر لکھا ہے اور عام قارئین میری کتابوں سے بخوبی واقف ہیں۔ کیا اب تک جو کچھ میں نے مفصل لکھا ہے اس کی تلخیص مناسب رہے گی؟ یہ چیز مصنف کے لیے ذرا پریشان کن ہوتی ہے۔

لیکن تجویز بہرحال اس لائق تھی کہ اسے گرم جوشی سے قبول کیا جائے۔

چنانچہ میں نے اسے عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے اپنے ذہن میں یہ بھی طے کیا کہ میں نے اب تک اسلام کے جو حقائق پیش کیے ہیں ان کا واضح خلاصہ بھی آجائے۔ اور ان سے متعلق نئے دلائل کا اضافہ بھی کردیا جائے۔ ساتھ ہی کچھ نئے ابواب بھی شامل کردیے جائیں۔



اسلام ایک منصفانہ کاز ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کی پیروی ناکام وکیلوں کے

ہاتھوں میں ہے۔ اکثر جب میں اسلام کے بارے میں گفتگو کرنے والوں کی باتیں سُنتا ہوں تو یہی خواہش ہوتی ہے کہ کاش وہ چپ ہی رہتے۔ اس موضوع پر کچھ نہ بولتے۔ ان میں بیشتر دین کو سمجھتے ہی نہیں اور جو تھوڑا بہت سمجھتے ہیں اسے بھی اچھے انداز میں پیش نہیں کرپاتے۔

اور ایسا اس زمانہ میں ہو رہا ہے جب بالکل حقیر نظریات بھی لوگوں کے سامنے خوب بنا سنوار کر پیش کیے جا رہے ہیں جیسے بدصورت عورت طرح طرح کے میک اَپ اور زیورات و ملبوسات میں اپنے آپ کو چھپالیتی ہے۔

لوگ فطری طور پر جس چیز کے بارے میں جانتے نہیں اس کے مخالف ہوتے ہیں۔ اب اندازہ کیجیے کہ جب مسلمان اپنے دین کو بے کم و کاست واضح اور بہترین انداز میں نہیں پیش کرتے اور حق کو صاف شفاف صورت میں سامنے نہیں لاتے تو وہ اس کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کر رہے ہیں۔؟

حق اگر واضح اور روشن ہو جائے تو دیدہ و دل کو خود بخود اپنی طرف کھینچتا ہے۔ آج کے لوگ اسلام کو بہترین انداز میں سمجھنے کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت مند ہیں قدیم کتابیں اپنے زمانے میں یقیناً مفید رہی ہوں گی اور اپنے دور کے لوگوں کے مسائل کو انھوں نے سلجھایا ہوگا لیکن اب وہ دَور ختم ہو چکا اور اس کے ساتھ ہی وہ روحانی و مادی مسائل بھی بدل چکے

آج سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ دین کو اس طرح جان سکیں جس سے ان کا نفسیاتی خلا پُر ہو اور وہ شکوک و شبہات دُور ہو جائیں جو استعمار کے حملے کے بعد سے الحاد و اباحیت کے دلال پیدا کرتے رہے ہیں۔



اگر چوتھی صدی ہجری کے آخر میں یہ ضرورت پیدا ہو گئی تھی کہ مسلمانوں کے لیے ”احیاء علوم الدین“ (مصنفہ امام غزالیؒ) جیسی کتاب لکھی جاتی تو ہمیں اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ دینی معارف بھی زمانہ کے گزرنے کے ساتھ اور خواہشاتِ نفس اور لہو و لعب

کے غلبہ کے ساتھ گرد آلود نظر آنے لگتے ہیں اور یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ گرد و غبار سے صاف کر کے پھر سے انھیں زندہ کیا جائے۔

یہ مسلمانوں کی ذمّے داری ہے کہ وہ اپنے دائمی ورثہ کے ساتھ دنیا کے سامنے آئیں ان کے پاس ایسی کتاب ہے جو کبھی پُرانی اور فرسودہ نہیں ہوسکتی۔

ان کے پاس اپنے نبیؐ کی صاف شفّاف سیرت ہے۔

روشنی کی ان تیز کرنوں کے ساتھ ہم کیسے راستہ بھٹک سکتے ہیں اور اندھیروں میں گُم ہوسکتے ہیں؟

آجکل دینی تعلیم کی کوتاہی یہ ہے کہ وہ حقیقت تک پہنچانے والی بصیرت پیدا نہیں کر پارہی ہے اور اس سلسلے میں اسی طرح عاجز و درماندہ ہے جیسے پھولوں سے لدے ہوئے چمن میں بھی وہ شخص بہترین خوشبوؤں سے لطف اندوز نہیں ہوپاتا جسے زکام ہوا ہو۔

اس کتاب میں ہم نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ نگاہوں کے سامنے سے پردہ ہٹانے کی کوشش کریں تاکہ حقیقت اپنے اصلی روپ میں نظر آسکے۔ اس میں ہم نے اپنی طرف سے کوئی چیز داخل نہیں کی ہے بلکہ خالص حقیقت کو اجاگر کرنے کے لیے صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے کلام کو اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔

واللہ ولی التوفیق

محمد غزالی

عقائد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام کیا ہے؟

یہ نیا نام، جسے چودہ صدیوں سے لوگ سنتے آرہے ہیں، اُس قدیم حقیقت کا عنوان ہے جس کا آغاز مخلوق کے وجود کے ساتھ ہی ہوا تھا اور جو انسانی زندگی کے دوش بدوش چلتی رہی ہے اور ان تمام رسالتوں کے ساتھ اس کا سلسلہ جڑا رہا ہے جنھوں نے انسانوں کا تعلق ان کے عظیم پروردگار سے جوڑا اور انھیں اس بات سے آگاہ کیا کہ اللہ ان سے کیا چاہتا ہے۔

لیکن یہ بات ذرا تشریح چاہتی ہے۔

یہ کہنے کا کیا مطلب ہے کہ یہ ایک قدیم حقیقت ہے۔؟

جواب یہ ہے کہ: یہی اللہ تعالیٰ اور انسانوں کے درمیان تعلق کا بنیادی عنصر ہے جس کی تصویر کشی سارے مذاہب کرتے رہے ہیں اور سارے ہی رسول یہی پیغام پہنچاتے رہے ہیں۔

وہ تمام رسولؑ جو پہلے زمانوں میں نمودار ہوتے رہے ہیں اور جن پر مختلف نسلیں ایمان لاتی رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حضرت موسیٰؑ سے یا حضرت عیسیٰؑ سے یا حضرت محمدؐ وغیرہ سے فرمایا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اسی طرح اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے جو کچھ ان پیغمبروں نے اپنے متبعین کو بتایا یا جو کچھ ان دوسرے پیغمبروں نے بتایا جن میں کچھ کے نام ہم جان سکے ہیں اور کچھ

کے نام نہیں جان سکے، دین ان سب کے نزدیک اپنے ارکان اور اپنے مقاصد کے اعتبار سے ایک ہی ہے اور اس ہمہ گیر دینی وحدت پر قرآن کریم نے متعدد مواقع پر زور بھی دیا ہے، اور یہ اصول بھی بیان فرمایا ہے کہ سارے انبیاءؑ ایک مشترکہ عمل میں بھائی بھائی ہیں اور نہ ان کی پیروی میں فرق کرنا جائز ہے نہ ہی پیغمبروں میں ایک دوسرے کے درمیان امتیاز کرنا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ (الشوریٰ - ۱۳)

تمہارے لیے دین میں راہ ڈال دی جس کا حکم کیا تھا نوحؑ کو اور جس کا حکم ہم نے ابراہیمؑ کو اور موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو کیا یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران ۸۴)

کہہ دو ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو کچھ اترا ہم پر اور جو کچھ اترا ابراہیمؑ و اسماعیلؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر اور جو ملا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور سب نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے۔ ہم ان میں کسی کو جدا نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

○

زمان و مکان کے اختلاف سے بے نیاز اس ہمہ گیر وحدت کی بنیاد ہے فطرت۔
جی ہاں۔ فطرتِ سلیمہ ہی اللہ کا دین ہے۔
اور فطرت انسان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ بس قلبِ سلیم اور فکرِ سلیم کا نام ہے۔
موجودہ زندگی اور ابدی زندگی کے لیے انسان کی صلاحیت بغیر اس سلامتِ قلبی و فکری کے پوری نہیں ہو سکتی۔
بسا اوقات ایسے افراد ملتے ہیں جو دین سے نسبت رکھتے ہیں اور اس کے مراسم و

مظاہر ان پر نمایاں نظر آتے ہیں لیکن ان کے دل اور ان کے خیالات مریض ہوتے ہیں یقین رکھیے کہ یہ لوگ دین سے اسی قدر دُور ہوتے ہیں جس قدر ان کے دلوں اور خیالوں میں کجی اور بے راہ روی ہوتی ہے۔

اگر کسی گھر پر بہترین رنگ و روغن کر دیا جائے جبکہ اس کے دیواریں گر رہی ہوں تو اس گھر کو صحیح حالت میں نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسی طرح اگر کسی انسان کی قلبی و ذہنی حالت کو خواہشات اور اوہام و خرافات نے بگاڑ رکھا ہو تو اسے ہم دیندار نہیں کہہ سکتے۔

حقیقی دینداری کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ قلبی و ذہنی حالت بالکل صحیح اور ہر بگاڑ سے دُور ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

(الروم - ۳۰)

سو تم ایک طرف کے ہو کر اپنا منہ دین پر سیدھا رکھو۔ وہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کے بنائے ہوئے میں تبدیلی نہیں۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔



اسلام جو تعلیمات لے کر آیا ان کا مقصد یہی ہے کہ فطرت کو ان اجنبی جراثیم سے محفوظ رکھا جائے جو برابر اس پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں جیسے انسان اس لیے غذائیں اور دوائیں استعمال نہیں کرتا کہ ان سے کوئی نیا جسم پیدا ہوگا یا وہ کوئی دوسری مخلوق بن جائے گا۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کا اصل وجود اسی طرح باقی رہے اور نشو ونما پاتا رہے جیسے اسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ فطرت والی آیت کے بعد ہی فطرت کی حفاظت کرنے والی آیت نازل فرماتا ہے:

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ

سب اس کی طرف رجوع ہو کر اس سے ڈرتے رہو اور نماز قائم رکھو اور شرک کرنے والوں

فَرَّقُوْا دِیْنَہُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْہِمْ فَرِحُوْنَ (الروم ۳۱-۳۲)

میں نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی اور ان میں بہت فرقے ہو گئے۔ ہر فرقہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے۔

فطرت کے تعلق سے دین کی تعلیمات کی وہی حیثیت ہے جو عقل کے تعلق سے زندگی و کائنات سے متعلق علوم کی۔

جس طرح انسانی فکر ان علوم کے ذریعہ اپنے دائرے وسیع کرتی ہے اور اپنے احکام کی تصدیق کرتی ہے۔ اسی طرح فطرت، دین کی تعلیمات کے ذریعہ صفائی و ہم آہنگی حاصل کرتی ہے اور سیدھا راستہ پہچانتی ہے۔

اسی لیے ان ذمّے داریوں کو سنبھالنا ناگزیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی سلامت روی کی ضمانت کے لیے مقرر فرمائی ہیں۔

وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْہَہٗٓ اِلَی اللّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی وَاِلَی اللّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ (لقمان-۲۲)

اور جو کوئی اپنا منہ اللہ کی طرف تابع کرے اور ہو وہ نیکی پر، سو اس نے مضبوط کڑا پکڑ لیا اور ہر کام کا انجام اللہ ہی کی طرف ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْہَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا۔ (النساء-۱۲۵)

اور اس سے بہتر کس کا دین ہوگا جس نے اللہ کے حکم پر پیشانی رکھی اور نیک کاموں میں لگا ہوا ہے اور چلا دینِ ابراہیم پر جو ایک ہی طرف کا تھا۔

آپ نے دیکھا؟

قرآن کریم دین کے تعلق سے فطرت کی اصل سابقہ رسالتوں کی طرف منسوب کرتا ہے۔

حضرت محمدؐ تعمیر کے لیے تشریف لائے تھے منہدم کرنے کے لیے نہیں۔

آپؐ اپنے سے پہلے کے رسولوں کی مخالفت کے لیے نہیں ان کی تائید و تصدیق کے لیے تشریف لائے تھے اور آپؐ کا دین اسلام اسی روشن انسانی فطرت کی علم برداری و نمائندگی کرتا ہے جس کے ذریعہ ہی اس کو سربلندی حاصل ہو سکتی ہے۔

سب سے برتر وجود

اسلام ــــــ واضح طور پر ــــــ اللہ تعالیٰ کے وجود کی تصدیق کی بنیاد پر قائم ہے اور اسی پر ایمان اس کے سارے قوانین کا محور ہے۔

قرآن کریم میں ایسی دسیوں دلیلیں بیان فرمائی گئی ہیں جو عقل وضمیر میں اس حقیقت کو جاگزیں کرتی ہیں اور مسلمان اس کے پورے شعور واحساس کے دائرے میں زندگی گزارتا ہے۔

اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ایک سائنداں لکھتے ہیں:

چار ہی احتمالات ہو سکتے ہیں۔

۱۔ وجود تمام تر وہم ہو، چاہے وہ ہماری محسوس دنیا سے تعلق رکھتا ہو یا ہماری آنکھوں سے اوجھل ماورائی دنیا سے۔ مثلاً ہم جس زمین پر چلتے ہیں یا جن گاڑیوں پر سوار ہوتے ہیں وہ سب محض خیال ہوں۔ قدیم وجدید فلاسفہ کے یہاں اس احتمال کا ذکر ملتا ہے۔

لیکن یہ احتمال اس قدر بے وزن ہے کہ اس سے صرف نظر ہی کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ یہ کہ دنیا ایک حقیقت ہے جو عدم سے خود بخود وجود میں آگئی اور اس میں کسی بیرونی محرک کا کوئی دخل نہیں۔

یہ احتمال بھی پہلے احتمال سے کم بے وزن نہیں۔

اور اس کو ماننے کا مطلب ہوگا اسباب اور مسببات کے قانون کو کالعدم قرار دینا اور ان تمام بنیادوں کو مسمار کر دینا جن پر علم و سائنس کا دار و مدار اور جن کے ساتھ زندگی رواں دواں ہے۔

۳۔ یہ کہ دنیا قدیم مادہ ہے (دنیا کی قدامت کا قول محض گمان ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ تسلیم شدہ بات یہ ہے کہ مادہ توانائی میں بدلتا رہتا ہے) اس کے وجود کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ اسی سے ایسے طویل مراحل کے ساتھ جن کی تشریح دشوار ہے، مختلف قسم کی مخلوقیں نمودار ہوتی ہیں۔ یہ احتمال کائنات کو کسی کارساز کا کارنامہ اور خود سے ہو جانے والی چیز دونوں بیک وقت بناتا ہے۔

مثلاً ایک شاندار عمارت کو دیکھا جائے پھر اس کی تعمیر میں جو کچھ مہارت اور ندرت نظر آئے اسے کسی انجینئر کی طرف منسوب کرنے کے بجائے مٹی، چھت اور کھڑکیوں کی طرف منسوب کر دیا جائے۔

یہ احتمال ایک نہ ختم ہونے والے کمال کا تصور پیدا کرتا ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اس میں بہترین حکمت اور ہمہ گیر علم کی کارفرمائی بھی ہے لیکن یہ ساری صفات منسوب کر دی جائیں مثلاً اس مٹی کی طرف جسے ہم پاؤں تلے روندتے ہیں یا اس ہوا کی طرف جسے ہم سانس کے ذریعہ کھینچتے ہیں اور یہ کہا جائے کہ وہ پیدا بھی کرتی ہیں اور فنا بھی کرتی ہیں!!!

انسانی عقل جب یہ یقین رکھتی ہے کہ پودوں کے اگنے کے لیے ــــــ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں ــــــ کچھ متعین صورتوں کا پایا جانا ضروری ہے اور قدرت و مشیئت کی یہ صورتیں مٹی اور پانی کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتیں۔

بلکہ ان دونوں کے علاوہ کسی وجود کی طرف نسبت بدیہی معلوم ہوتی ہے۔ تو اب چوتھا احتمال ہی باقی رہتا ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کا وجود۔

اور یہ عقلی احتمال ہی تخلیق کے قصہ کی واحد صحیح تشریح ہے یا دوسرے الفاظ میں قبول و احترام کے سب سے زیادہ لائق ہے۔

یہ کتنی بے وزن بات ہوگی کہ آپ مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کریں کہ ماں کے پیٹ میں جنین ماں کی نگرانی میں یا باپ کی مدد سے، یا پیٹ اور سینے کے درمیان مختلف آلات کی مدد سے نشوونما پاتا ہے اور ان میں سے کوئی جنین کی آنکھ بناتا ہے کوئی کان وغیرہ وغیرہ۔

نہیں نہیں

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ۔ (الانعام ۔ ۹۱)

بس اتنا کہہ دو کہ اللہ۔ پھر انھیں اپنی دلیل بازیوں سے کھیلنے کے لیے چھوڑ دو۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ الَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۔ (السجدہ ۔ ۶-۹)

وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا زبردست اور رحیم۔ جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی۔ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی پھر اس کی نسل ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح ہے پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیے آنکھیں دیں اور دل دیے۔ تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔

قرآن کریم میں کثرت سے ایسی دلیلیں بیان کی گئی ہیں جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی معرفت کی طرف لے جاتی ہیں۔

یہ دلیلیں انتہائی لطیف اور دل کے تاروں کو چھونے والی ہیں اور ان سب کا مقصد انسانی فکر کو بیدار کرنا ہے تاکہ وہ اپنے اردگرد پر نگاہ ڈالے اور اس کی نشانیوں پر غور کرے۔

اور انسان اس نگاہ اور اس غور و فکر کے بعد یقیناً اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے گا۔

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ
وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔
(الذاریات - ۲۰ - ۲۱)

زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین والوں کے لیے۔ اور خود تمہارے اپنے وجود میں ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ فارس کا فرماں روا کسریٰ نوشیرواں ایک رات لیٹا تو اس کی نگاہیں افق میں دور دور تک چکر لگانے لگیں تب وہ کہنے لگا:

"اے آسمان! تو جس عمارت کی چھت ہے بلاشبہ وہ عظیم ہے۔
تو جس گھر کو ڈھانکے ہوئے ہے، بلاشبہ وہ عظیم ہے۔
تو جس چیز پر سایہ فگن ہے وہ یقیناً بہت بڑی ہے۔
اور تعجب کرنے والوں کے لیے تجھ میں بہت سی تعجب خیز چیزیں ہیں
کاش میں جان سکتا کہ: کیا تیرے نیچے ستون ہیں جنھوں نے تجھے تھام رکھا ہے یا تیرے اوپر کچھ مضبوط کھونٹیاں ہیں جن کے سہارے تو لٹکا ہوا ہے؟ بلاشبہ جس بادشاہ کی قدرت نے تجھے تھام رکھا ہے وہ یقیناً عظیم قدرت والا ہے اور وہ اپنے اندازے کے مطابق تجھے گول دائرے میں ڈھالنے میں یقیناً بڑی حکمت و باخبری سے کام لینے والا ہے۔
اور جو اس عظمت پر غور کرنے سے غافل رہ جائے وہ یقیناً کوتاہ ذہن اور غبی ہے۔
اے آسمان! کاش میں جان سکتا کہ تو کس طرف سے طلوع ہوتا ہے؟
کس طرح اپنی مسافت طے کرتا ہے۔؟
کس طرح ڈوبتا ہے؟
اور ڈوبنے کے بعد کہاں جا گرتا ہے؟
کاش میں جان سکتا کہ: تو ساکن ہے یا متحرک؟
تیری صفتِ خاص کیا ہے؟

تیرا رنگ کیا ہے؟
تو جن ناموں سے پہچانا جاتا ہے وہ نام کس نے رکھے ہیں؟
پاک ہے وہ ذات، تو جس کے حکم کی بجا آوری کر رہا ہے اور جس کی مشیت و مرضی سے تو رواں دواں ہے۔
اور جس کی کاریگری کی بدولت تو کھڑا ہوتا ہے اور واپس چلا جاتا ہے۔"

رات کے بیکراں اندھیروں کے مہیب سناٹے پر غور کیجیے، پھر آسمان میں بکھرے ہوئے مسکراتے تاروں پر نگاہ ڈالیے آپ کو محسوس ہوگا کہ تاریکی کے ان دبیز پردوں کو چیرتی ہوئی کوئی دلنواز نورانی آواز آپ کے دل کے تاروں کو جھنجھوڑ رہی ہے ٹھنڈک اور سکون سے بھرپور روشنی کی کرنیں آہستہ آہستہ آپ کے دل کو منوّر کرتی جا رہی ہیں اور ایک لطیف احساس سے سرشار ہو کر آپ کا دل ایک ازلی نغمہ گنگنانے لگتا ہے۔

"بے شک تو ہی اللہ ہے۔"

آپ ایک اتھاہ سمندر کے کنارے کھڑے ہیں تا حدِ نگاہ پانی ہی پانی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ نگاہ کی حدیں جہاں ختم ہوتی ہیں وہاں نیلگوں آسمان نیلگوں پانی سے مل رہا ہے صبح کو اسی نیلگوں سنگم پر سورج آہستہ آہستہ اپنی کرنیں پھیلاتا ہوا نظر آئے گا اور شام کو اپنی کرنیں سمیٹتا ہوا رنگ برنگی شفق بکھیرتا ہوا اور گنگناتا ہوا جیسے جنت سے کسی بلبلِ خوش نوا کے دلنواز نغمے کی صدا آ رہی ہو۔

عظمت سے بھرپور سمندر کی ان جلوہ آرائیوں کو دیکھ کر آپ بے ساختہ اس کے خالق و مدبّر کی عظمت کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور آپ کا دل پکار اٹھے گا۔

"بے شک تو ہی اللہ ہے۔"

آپ ایک سمندری جہاز میں ہیں۔ ساحل نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ جدھر نگاہ اٹھتی ہے سمندر کی بے کراں وسعتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ اچانک ہوا تیز ہونے لگتی ہے بادل گرجنے لگتے ہیں، بجلیاں چمکنے اور کڑکنے لگتی ہیں، اندھیرا گھرا ہوتا

چلا جاتا ہے۔ بڑھتے ہوئے طوفان کی موجیں جہاز کو کھلونا بنا کر کھیلنے لگتی ہیں، ناخدا پریشان و ششدر ہو گئے ہیں۔ جہاز کسی طرح ان کے قابو میں نہیں آرہا ہے۔ ہر طرف سے موت کے خونخوار پنجے بڑھتے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں۔ آپ کا دل اپنے پروردگار سے آہ و فریاد کر رہا ہے۔ اچانک طوفان تھمنے لگتا ہے اور نجات کی امیدِ جاں فزا اپنا روئے زیبا دکھلانے لگتی ہے۔ آپ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں۔

"بے شک تو ہی اللہ ہے۔"

آپ سخت بیماری میں پڑے ہیں۔ ڈاکٹروں کی ساری ترکیبیں ناکام ہو چکی ہیں چارہ گر مایوس ہو چکے ہیں۔ تیمار دار عزیز و قریب زبانِ حال کے آنے والی سنگین حقیقت کی ترجمانی کر رہے ہیں، مخلصین آہ و زاری کے ساتھ دعاؤں میں مصروف ہیں۔ دنیا داغِ مفارقت دے رہی ہے، دولت بیکار ہو چکی ہے، جاہ و منزلت سراب ثابت ہو چکے ہیں، آرزوئیں دم توڑ چکی ہیں، دل کی خواہشیں باطل ہو چکی ہیں۔ دنیا کے ہر بندھن کو توڑ کر آپ اپنے پروردگار کی طرف دل لگاتے ہیں، اچانک رحمتِ حق جوش میں آتی ہے اور مایوسی امید سے بدل جاتی ہے۔ آپ کا دل بول اٹھتا ہے:

"بے شک تو ہی اللہ ہے۔"

آپ کی نگاہ کبھی ناشگفتہ کلیوں پر پڑتی ہے کبھی مسکراتے ہوئے پھولوں پر آپ ان کے حسن سے مسحور ہو کر رہ جاتے ہیں، کبھی طائران خوشنوا کے نغمے آپ کا دامنِ دل کھینچ لیتے ہیں اور دل خوشی و انبساط سے بھر جاتا ہے۔ ایسی جانفزا چیزیں کون پیدا کر سکتا ہے۔

کائنات میں عظمت کے مناظر دیکھیے، رحمت کے مناظر دیکھیے، جمال و جلال کے مظاہر دیکھیے، دوام و بقا کے مناظر دیکھیے، قدرت و قضا کے مناظر دیکھیے آپ کے دل کے تاروں سے بے ساختہ یہی نغمہ نکلے گا۔

"بے شک تو ہی اللہ ہے۔"

توحید

لوگ قدیم زمانوں میں بھی کئی معبودوں کے شوق میں مبتلا رہے ہیں اور آج کے دور میں بھی کئی معبودوں کا تصور لغو سی خرافات ہے جس کی اسلام نے پوری قوت سے مخالفت کی ہے اور لوگوں کے ایک ایک وہم کے تار و پود بکھیرے ہیں تاکہ اس سلسلے میں شبہات کو دور کیا جائے اور تاریکیوں کے پردے چاک کر دیئے جائیں۔

اور اس میں کچھ تعجب کی بات بھی نہیں کیونکہ عقیدہ و عمل کے میدان میں مطلقاً توحید ہی اسلام کی پہلی علامت اور نعرہ ہے۔ یہی اس کی پہچان بھی ہے اور اسی کی وجہ سے اس کی مخالفت پر کمر بھی باندھی گئی ہے۔

اس موضوع پر لمبی بحث چل چکی ہے جس کا ذکر قرآن نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے۔

أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ آلِهَةً أُخْرَىٰ قُلْ لَا أَشْهَدُ قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَإِنَّنِي بَرِيءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ۔	کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ اور معبود بھی ہیں۔ کہہ دو میں تو گواہی نہ دوں گا۔ کہہ دو وہی ایک معبود ہے اور میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔
(الانعام ــــ ۱۹)	
وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَإِيَّايَ	اور اللہ نے کہا ہے دو معبود مت پکڑو۔ وہ معبود ایک ہی ہے سو مجھ سے

فَارْهَبُوْنَ۔ (النحل۔ ۵۱) ڈرو۔

اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ — بے شک تم سب کا حاکم ایک ہے۔
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا — آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ اس
وَرَبُّ الْمَشَارِقِ۔ (الصافات ۴۔ ۵) — کے بیچ میں ہے اور مشرقوں کا رب۔
وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰـهَ اِلَّا — اور تم سب کا ایک ہی معبود ہے اس
هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔ — کے سوا کوئی معبود نہیں بڑا مہربان نہایت
(البقرہ ــ ۱۶۳) — رحم والا ہے۔

یہی واحد پروردگار لوگوں کا ولی و نگراں ہے۔ نہ اس کے علاوہ کسی دوسرے کی ولایت سے وابستگی اختیار کرنا جائز ہے اور نہ صرف اس کے علاوہ کسی اور سے لو لگانا۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ — کیا انھوں نے اس کے سوا کام بنانے
فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ — والے پکڑے ہیں سو اللہ وہی ہے جو کام
الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ — بنانے والا ہے اور مُردوں کو جلاتا ہے
قَدِيْرٌ۔ — اور وہ ہر چیز کر سکتا ہے۔
(الشوریٰ ــ ۹)

اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ — اسی پر چلو جو تم پر اترا تمہارے رب کی
وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ قَلِيْلًا — طرف سے اور اس کے سوا رفیقوں کے
مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔ — پیچھے نہ چلو تم بہت کم دھیان کرتے ہو۔
(الاعراف ــ ۳)

وہی لوگوں کی شفاعت کرنے والا، ان کی لغزشوں سے درگزر کرنے والا اور مشکلات و مصائب میں ان کا ملجا و ماویٰ ہے کوئی دوسرا اس کا ساجھی نہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ — کیا انھوں نے اللہ کے سوا کوئی سفارش
شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ — والے پکڑے ہیں کہو اگرچہ ان کو اختیار

شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

نہ ہو کسی چیز کا اور نہ سمجھ۔ کہو اللہ کے اختیار میں ساری سفارش ہے آسمان اور زمین میں اسی کا راج ہے۔

(الزمر ۴۳-۴۴)

اور اس توحید کی بنیادیں ——— جیسا کہ اسلام نے واضح طور پر بتایا ہے ——— اس طرح ہیں:

کیا یہ تمام عالم ایک ہی خالق کا نہیں ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور جو اس کی نگرانی کرتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ وہ آسمان اور سیارے جنھیں ہم دور سے دیکھتے ہیں، وہ زمین جسے ہم قریب سے پہچانتے ہیں، نباتات، حیوانات اور مٹی و پانی جیسے جمادات وغیرہ ان سب کی تنظیم میں ایک ہی چھاپ نظر آتی ہے اور سب ایک ہی قانون کی پیروی کر رہے ہیں۔

اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی ایک خدا نے بعض براعظموں کو پیدا کیا ہے اور کسی دوسرے خدا نے بقیہ براعظموں کو۔ یا یہ کہ ایک خدا نے زمین پیدا کی، دوسرے خدا نے چاند۔ کیونکہ اس طرح کا خیال خود بخود ساقط ہو جاتا ہے۔

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔

کیا انھوں نے اللہ کے لیے کچھ شریک ٹھہرائے ہیں کہ انھوں نے کچھ پیدا کیا ہے جیسا کہ اللہ نے پیدا کیا پھر ان کی نظر میں پیدائش مشتبہ ہو گئی کہو اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی اکیلا زبردست ہے۔

(الرعد ۱۶)

قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا بَلْ هُوَ اللّٰهُ

کہو مجھ کو دکھلاؤ تو سہی جن کو اس سے [illegible] ساجھی قرار دے رکھا۔ [illegible]

الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ۔ نہیں، وہی اللہ زبردست حکمتوں والا ہے۔ (سبا۔ ۲۷)

زمین کو سورج سے ایک خاص دوری پر رکھنا ہی زندہ وجودوں کے وجود و بقاء کا موقع فراہم کرتا ہے کیونکہ ان کے جسموں کی حیثیت، ان کے حواس کی کارکردگی، کھیتیوں کی افزائش اور اس ہوا کی لطافت جس میں وہ سانس لے رہے ہیں۔ یہ سب اسی پر موقوف اور اسی سے مربوط ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کے خود اپنی جگہ چکر لگانے اور سورج کے ارد گرد چکر لگانے، سورج کے فضائے بسیط میں تیرنے اور سیاروں کے ایک خاص نظام کے مطابق گردش کرنے میں ایک متعین نظام کی کارفرمائی ہے اور ان سب کی دیکھ بھال ایک ہی ارادہ و مشیت کے ذمے ہے اور ان سب کی ترتیب و تنظیم اور ہم آہنگی ایک حکمت کی نشاندہی کرتی ہے یعنی یہ کہ ان سب کا ایک ہی پروردگار ہے جس کا کوئی ساجھی نہیں۔

پھر کیا کسی اور نے کبھی اس کا دعویٰ بھی کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ الوہیت میں شریک ہے اور تخلیق، رزق رسانی، عدم سے وجود میں لانے، وجود سے عدم میں پہنچانے اور اس وسیع کائنات میں زندگی کے معاملات کی تنظیم و تدبیر میں حصہ بٹا رہا ہے؟

آج تک کسی نے اس کی جرأت نہیں کی۔

شرک کی ساری کہانی بس اتنی ہے کہ کچھ ناواقف لوگوں نے کسی پتھر کو مقدس قرار دے لیا یا بعض نیک لوگوں کو مقدس بنا لیا اور ان کی طرف وہ صفات منسوب کر دیں جنھیں وہ نہیں چاہتے تھے اور نہ کسی کو اس کی اجازت ہی دے سکتے تھے کہ ان صفات کو ان کی طرف منسوب کریں۔

یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا بعض کم فہم لوگوں کے ذہنوں کی خیال آرائی سے زیادہ کچھ نہیں، حقیقت سے اس کا کچھ بھی تعلق نہیں جیسے کوئی

یہ سمجھنے لگے کہ مثلاً امریکا میں دو صدر جمہوریہ ہوتے ہیں جو فرمان جاری کرتے ہیں اور ملک کی سیاست چلاتے ہیں۔ یا مثلاً انگلینڈ میں دو بادشاہ حکومت کررہے ہیں۔

چونکہ مشرکین توحید کی حقیقت کسی قدر محسوس کرتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ انھوں نے خدا کے جو شریک گھڑے ہیں وہ کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ اس لیے انھوں نے ان نام نہاد معبودوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک طرح کا تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی کہ شاید اسی تعلق سے ان کے معبودوں کو کچھ حیثیت حاصل ہوجائے۔

چناں چہ انھوں نے ان معبودوں کو اللہ تعالیٰ کی اولاد (وغیرہ) قرار دیا۔

قرآن کریم نے اس بہتان کی صاف صاف تردید فرمائی۔

أَلَا إِنَّهُمْ مِنْ إِفْكِهِمْ لَيَقُولُونَ وَلَدَ اللَّهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ۔

(الصافات ۱۵۱ - ۱۵۲)

وہ اپنا بنایا ہوا جھوٹ کہتے ہیں کہ اللہ کے اولاد ہوئی اور وہ بے شک جھوٹے ہیں۔

مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ۔

(المومنون ۹۱)

اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے اور کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہوجاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔ پاک ہے اللہ ان باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ هُوَ الْغَنِيُّ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ إِنْ عِنْدَكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ بِهَٰذَا أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ قُلْ إِنَّ الَّذِينَ

لوگوں نے کہہ دیا اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے سبحان اللہ! وہ تو بے نیاز ہے، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کی ملک ہے تمہارے پاس اس قول کے لیے آخر دلیل کیا ہے؟ کیا تم اللہ

يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ۔

(یونس ۶۸-۶۹)

کے متعلق وہ باتیں کہتے ہو جو تمہارے علم میں نہیں ہیں۔ اے نبیؐ کہہ دو کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پا سکتے۔

اس طرح کی خام خیالیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اسلام نے یہ واشگاف کر دیا کہ نہ یہ ممکن ہے کہ اللہ سے پہلے کوئی معبود رہا ہو نہ یہی ممکن ہے کہ اس کی ذات سے کوئی معبود نکلے۔ نہ اس کا کوئی باپ ہے نہ بیٹا، نہ اس کے یہاں کسی ماں کی جگہ ہے نہ بیوی کی۔ اس کی ذات کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ اس کی پیدا کردہ مخلوق ہے اور اسی کی محتاج ہے۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ۔

(انعام ۱۰۱-۱۰۲)

وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کوئی اس کی شریکِ زندگی ہی نہیں ہے اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے یہ ہے اللہ تمہارا رب کوئی خدا اس کے علاوہ نہیں ہے۔ ہر چیز کا خالق، لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔

کبھی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، مختلف طرح کے اعزاز و اکرام سے نوازتا ہے لیکن جب وہ کسی نیک شخص یا جماعت کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے تو یہ نسبت حقیقی رشتے والی نسبت نہیں ہوتی کیونکہ ایسا بالکل ناممکن ہے۔

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ سُبْحٰنَهٗ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ

اگر اللہ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا برگزیدہ کر لیتا پاک ہے وہ اس سے (کہ کوئی اس کا

الْقَهَّارُ۔ بیٹا ہو) وہ اللہ ہے اکیلا اور سب پر غالب۔

(الزمر۔۴)

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔

(الاخلاص ۱۔۴)

کہو وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔

عقیدہ میں توحید کے ساتھ ہی عمل میں توحید کا نمبر آجاتا ہے۔ مسلمان کے لیے واجب ہے کہ وہ اپنے پروردگار سے محبت کرے، اسی پر انحصار کرے اور اسی کے لیے اخلاص پیدا کرے۔

اس کے دل کے دھڑکنوں اور ضمیر کے احساسات کا رخ اسی کی طرف ہو۔ کسی اور کی طرف وہ ذرا سا بھی رخ نہ کرے۔

مسلمان صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے۔ اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتا۔ اس کے سوا کسی کی فرماں برداری نہیں کرتا نہ کسی کا حکم برپا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حلال قرار دیا ہے اسے حلال سمجھتا ہے اور جو کچھ حرام قرار دیا ہے اسے حرام مانتا ہے۔ جو کچھ اسے ہدایت کی گئی ہے اسی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اور جہاں روک دیا گیا ہے وہیں رک جاتا ہے۔ مسلمان سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے سامنے سر نہیں جھکاتا، اس کے ماسوا ہر چیز کے سامنے سیدھا کھڑا رہتا ہے۔

اپنے واحد خالق کی عظمت اور کائنات اور انسانوں پر اس کے مکمل غلبہ و اقتدار کی پہچان اس کے دل میں ترغیب و خوف کے احساسات کو صحیح سلامت رکھتی ہے۔ وہ نہ پریشان و پراگندہ خیال ہوتا ہے نہ انحراف اور کج روی میں مبتلا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دل میں عقیدۂ توحید کا جاگزیں ہونا قوت و عزت کے تمام اوصاف کی بنیاد بن جاتا ہے اور سچا مومن کبھی ان سے جدا نہیں ہوتا۔

قضا و قدر

بہت سے لوگوں کے نزدیک قضا و قدر مبہم بلکہ پریشان کن الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن غور کرنے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ الفاظ ایسے لطیف مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے اور ذہن کو اطمینان حاصل ہو جائے۔

کیا آپ کو اس میں کچھ شک ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز جانتا ہے؟ کیا جب اطمینان بخش دلیلوں کی بنیاد پر آپ کو یہ یقین حاصل ہو چکا کہ وہ ان تمام مخلوقات کا خالق ہے تب آپ کو اس میں شک ہو رہا ہے کہ وہ اس کائنات کے ہر ذرّہ کی حالت و کیفیت، اس کی ابتدا و انتہا اور اس کے آخری ٹھکانے اور انجام کی پوری پوری خبر رکھتا ہے؟

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ۔ — کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ باریک بین اور باخبر ہے۔

(الملک-۱۴)

یہ بات کہ رب العالمین کائنات میں موجود ہر شے کو جانتا ہے بالکل ظاہر و باہر ہے اور اس کائنات کے مطالعہ کے تعلق سے انسان کی بصیرت جتنی جتنی بڑھتی جائے گی اتنا ہی اس کا یہ یقین بھی بڑھتا جائے گا کہ علم الٰہی اتنا وسیع و ہمہ گیر ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ماضی یا حال و مستقبل کی کوئی خبر بھی اس سے اوجھل رہ جائے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ — غیب کا علم رکھنے والا اس سے ذرّہ برابر

ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَا اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۔

(سبا - ۳)

کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی، سب کچھ ایک نمایاں دفتر (کتاب میں) درج ہے۔

لیکن یہ کتابِ مبین ہے کیا؟

علمِ الٰہی کا رجسٹر، جس کی صفت اوپر بیان کی گئی، ایسا زبردست رجسٹر ہے جو پورے وجود کو اور اس کی ہر اگلی پچھلی چیز کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

یہ حماقت ہی ہوگی کہ آپ یہ گمان کرنے لگیں کہ مخلوقات جو کچھ کر رہی ہیں اللہ اسے نہیں جانتا۔ وہ ہمیشہ سے ہی سب کچھ جانتا ہے۔ ورنہ وہ نہ خالق و رازق ہوتا نہ خیر و شر پر جزا دینے والا مالک و مختار۔

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ۔

(القمر ۵۲ - ۵۳)

جو کچھ انھوں نے کیا ہے وہ سب دفتروں میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی موجود ہے۔

جی ہاں! ہمہ گیر و نکتہ رس علمِ الٰہی کے رجسٹروں میں ہر چیز لکھی ہوئی ہے۔ اور قرآن کریم بار بار اس حقیقت پر زور دے چکا ہے۔

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ۔

(الحدید - ۲۲)

کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب (یعنی نوشتۂ تقدیر) میں لکھ نہ رکھا ہو۔ ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان کام ہے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ: اس علم سے ہمارا کیا تعلق ہے؟

کیا اس علم کی سچائی ـــــــ جس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا ـــــــ ہمارے

ارادہ اور ہمارے اعمال پر اثر انداز ہوتی ہے۔؟

جواب ہے: نہیں۔ اور جو یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم لوگوں کو عمل یا ترکِ عمل پر مجبور کرتا ہے۔ وہ غلط کہتا ہے۔

جو کچھ ہم خود سے کرتے ہیں یا جو کچھ ہمارے ساتھ ہوتا ہے علم الٰہی کا کام اس کا سبب بننا اور اس کی رہنمائی کرنا نہیں ہے۔

بلکہ اس کا کام انکشاف و ادراک کے نظریہ سے زیادہ نہیں اور یہ کمالِ الٰہی کے معاملات میں سے ہے۔

اور ہم جب اس کا اعتراف کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان عظمت و بلندی کا اعتراف کرتے ہیں۔



کوئی کہہ سکتا ہے کہ: یہ مان لیا جائے کہ علمِ الٰہی کا لوگوں کو خیر یا شر پر مجبور کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔

اور یہ کہ کتابِ ازل ایک ایسا رجسٹر ہے جس کا معاملہ ہم سے متعلق نہیں اگرچہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔

لیکن مشیتِ الٰہی جو نافذ ہے جب اس محیط علم کے ساتھ مل جائے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو جیسا چاہا پیدا کیا، جیسے چاہا اس کے عناصر ترتیب دیے، جیسے چاہا مخلوق کے مراتب میں ہم آہنگی پیدا کی اور وہ جو بھی چاہتا ہے کرتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان مشیت و قدرت کے ہاتھ میں کھلونا ہے۔

سابقہ علم کے ساتھ، انسانوں کا اپنا کوئی وجود ہے نہ اختیار۔

ہم کہیں گے: یہ ارادۂ الٰہی کا طفلانہ تصور ہوگا اور اس طرح کے تصوّر نے بعض مریض ذہنوں کو روشنی سے تاریکی میں پہنچا دیا۔

وہ لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے کہہ دیتا ہے

"ہو جا" پھر یہ لفظ ادا ہوتے ہی پلک جھپکتے صحرا گلزار ہو جاتا ہے، غربت دولت سے بدل جاتی ہے، بانجھ اولاد والی ہو جاتی ہے اور شکست خوردہ فتح یاب ہو جاتا ہے۔
جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ طفلانہ خیال ہے۔
ارادۂ الٰہی اس سنتِ الٰہی کا نام ہے جو اس نے کائنات کے لیے مقرر کر رکھی ہے اور جس کی بنیاد پر آسمان و زمین کا نظام قائم ہے۔
جب اللہ تعالیٰ کسی آدمی کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ عدم کو یہ حکم نہیں دیتا کہ آدمی ہو جا اور اچانک ایک بھرپور آدمی سامنے آجاتا ہے۔
ہرگز نہیں۔ بلکہ سارے کام اسی ترتیب کے ساتھ چلتے ہیں جو پروردگارِ عالم نے مقرر فرمائی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ انسان پہلے نطفہ بنتا ہے، پھر جنین، پھر نوزائیدہ، پھر بچہ، پھر لڑکا پھر پورا انسان۔
اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کوئی پھل پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو یہ ارادہ حسبِ معمول عمل کے تسلسل سے گزرتا ہے۔ پہلے بیج ڈالا جاتا ہے، پودے کو پانی دیا جاتا ہے، ماہ و سال گزرتے ہیں، سردی و گرمی کے مراحل آتے ہیں اور پھل تیار ہونے تک دیکھ بھال کرنے والے ہاتھ برابر اپنی ذمّے داری ادا کرتے رہتے ہیں۔
انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس کی ذمّے داریوں کے مطابق مادّی و معنوی خصوصیات سے نوازا ہے۔ اسے بلاشبہ آزادی دی گئی ہے۔ یہی اس کے لیے ارادۂ الٰہی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انسان کو کچھ اور بنا دیتا۔
اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو صرف ایک پہلو کے ساتھ تخلیق فرمایا اگرچہ انھیں ادراک کی قوت بھی دی۔
جبکہ انسان کی فطرت میں مختلف پہلو رکھ دیے اور اسے اس کی صلاحیت دی کہ وہ دائیں بائیں جیسے چاہے اپنا رُخ کر سکتا ہے۔
یہی انسان کے لیے ارادۂ الٰہی ہے اس میں کوئی جبر نہیں۔
بعض ناسمجھ ارادۂ الٰہی کا تصور ایسا رکھتے ہیں جو جہالت و کوتاہ فہمی پر مبنی ہے۔

وہ سمجھتے ہیں کہ ارادۂ الٰہی کوئی اندھیرے کا تیر ہے جو بغیر کسی تیاری اور مقصد کے چلایا جاتا ہو۔ اور اس طرح کی پریشان خیالیوں کا نام قضا و قدر رکھتے ہیں جبکہ اسلام اس سے بالکل بری الذمہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کسی کو کسی معاملے پر مجبور نہیں کرتا۔ اس کا ارادہ اس کائنات میں بلندی پر فائز ہے جب ہر وجود اس کا مرہونِ منت ہے تو اس کی مشیت پر اعتراض کون کرسکتا ہے۔

اہلِ عقل و دانش کو اس ارادۂ الٰہی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اشیاء کی خصوصیات، صلاحیتوں اور طاقتوں کی فطرتیں اور مخلوقات کے امتیازی اوصاف اس عظیم ارادۂ الٰہی کا ٹھوس ثبوت اور منظہر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے کہ حیوان گونگا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں اسکی ذمّے داری صرف اس کو حاصل شدہ مادی صفات کے تابع ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ انسان صاحبِ عقل اور مکلّف ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں انسان کی ذمہ داری اس کو عطا کی گئی صلاحیتوں اور طاقت و آزادی کے تابع ہے۔

اب جو انسان اپنی صلاحیت اور ارادہ سے دستبردار ہوجائے اور اپنے آپ کو گونگے حیوان یا نباتات کی طرح سمجھنے لگے تو وہ گویا اپنے پروردگار اور خود اپنے وجود کو جھٹلا رہا ہے۔

کچھ لوگ یہ کہہ کر معطل پڑے رہتے ہیں کہ ہمیں کوئی طاقت حاصل نہیں نہ ہمارا کوئی ارادہ و اختیار ہے۔ جب ہر شئے پہلے سے لکھی جاچکی ہے تو عمل کس لیے کیا جائے، جو اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی وہی ہوگا۔

اس طرح کی بات اسلام پر بہتان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کی صورت مسخ کرنا ہے اور اس زندگی میں انسان کی ذمّے داری سے فرار ہے۔

قاضی ابوبکر بن عربی کہتے ہیں: انسان سے بہتر اللہ تعالیٰ کی کوئی دوسری مخلوق نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے قدرت و صلاحیت والا، بات چیت کرنے والا، سننے والا، دیکھنے والا اور حکمت و تدبّر والا بنایا ہے۔

اور یہ صفاتِ اللہ تعالیٰ کی ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صفات پر پیدا کیا ہے"۔

اب دیکھیے پہلے سے مشیتِ الٰہی نے کیسے چاہا کہ انسان اس بہترین طرز پر پایا جائے۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا۔ (الدھر۔ ۲-۳)

ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اس کو سننے اور دیکھنے والا بنایا، ہم نے اسے راستہ دکھا دیا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔

اس کے باوجود کچھ لوگ اپنی مفروضہ ذمّے داری وکردار اور اپنی حقیقت کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ اور یہ کہہ کر اپنی صلاحیتوں اور ارادہ واختیار سے دستبردار ہو جاتے ہیں کہ صلاحیت اللہ ہی کی ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہی سب کچھ ہے۔

یہ فکروادراک کی کوتاہی کے سوا کچھ نہیں۔

اسلام میں اس مفہوم کے ساتھ قضاوقدر کا کوئی وجود نہیں۔

قضاوقدر تو یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کو کمالِ مطلق کے ساتھ پہچانیں جیسا کہ پہچاننا چاہیے اور پھر اپنے طرزِ عمل پر اس پہچان کے اثرات کی چھاپ لگائیں۔ محض ذمّے داری سے بچنے کے لیے یہ جائز نہیں ہوگا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طاقت ومشیت واختیار کی بات کریں۔

قضاوقدر اور اللہ تعالیٰ کے مطلق اقتدار کی بات تو نتائج کے مطالعہ کے وقت مناسب ہوتی ہے نہ کہ اسباب اختیار کرتے وقت۔

اس لیے کہ اسباب اختیار کرتے وقت آپ وہ ذمّے داری ادا کرتے ہیں جس کا آپ کو موقع دیا گیا ہے اور جس کے لیے آپ کو پیدا کیا گیا ہے۔ اب اگر نتائج آپ کی پسند کے مطابق نکلتے ہیں تو آپ کو اپنی ذمّے داری کی ادائیگی پر خوش ہونا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی مدد وتوفیق پر شکر ادا کرنا چاہیے ورنہ وہ رکاوٹ ڈالنے پر بھی قادر تھا۔

اور اگر نتائج آپ کی طاقت سے باہر کے اسباب کی وجہ سے آپ کے اندازے کے خلاف نکلتے ہیں تو آپ یہ سمجھ کر اطمینان حاصل کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہی تھی۔ کسی شکست یا محرومی پر آپ کو ہائے توبہ مچانے کی ضرورت نہیں۔

قضا و قدر کا عقیدہ، جو اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے اور جو کچھ انسان کی ذمے داری ہے ان دونوں کے درمیان توازن پیدا کرتا ہے ورنہ انسان سرکشی اور بھول کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔

سرکشی اس بنیاد پر کہ وہ اس کائنات میں اپنے آپ کو سب کچھ سمجھنے لگے اور یہ بھول جائے کہ اپنی بلند خصوصیات کے باوجود وہ کچھ معاملات کے آگے مجبور ہے جو اس کے ارادہ و صلاحیت کو ناکام کر سکتے ہیں اور اسے خواہی نہ خواہی، یہ یاد دلا سکتے ہیں کہ کائنات کو اب بھی اس کا خالق حقیقی چلا رہا ہے اور اس کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے معاملے پر قادر و غالب ہے۔

اگر پوری توجہ اور سلامتِ ذہنی کے ساتھ اپنے ارد گرد، اپنے سے پہلے و بعد کے حالات، خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو پیش آنے والے واقعات پر غور کرتے تو آپ کو اس میں ذرا بھی شبہ نہ رہ جاتا کہ تمام لوگوں کے حالات پر اعلیٰ ترین نگرانی پورے انضباط اور باریک بینی پر مبنی ہے اور رات و دن کی الٹ پھیر کرنے والے نے حدود مقرر کر دی ہیں انہیں کے دائرے میں لوگ چکر لگا رہے ہیں وہی جلاتا اور مارتا ہے۔ اور وہی کھینچتا اور ڈھیل دیتا ہے۔

آپ کو ارادہ اور فکر و عمل کی آزادی حاصل ہے۔

اور آپ کو انصاف و حکمت کے ساتھ بھلائی کا بدلہ ملے گا اور برائی پر مواخذہ ہوگا۔

آپ کو حکم دیا جاتا ہے اور منع کیا جاتا ہے کیونکہ آپ میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ آپ امر و نہی کو قبول کر سکیں۔ اسی طرح عمل اور ترکِ عمل کی صلاحیت دی گئی ہے۔

لیکن ان سب کے باوجود آپ ایک بڑے منصوبے کا حصہ ہیں اور اس منصوبے کو وہی جانتا ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار ہے اور جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اور اس بڑے منصوبے کا حصہ بننے کی وجہ سے آپ زندگی کی راحت و رنج اور نعمت و مصیبت کے مختلف معاملات میں محکوم ہیں اور جس چیز میں آپ مجبور ہیں اس پر آپ کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں پر لوگوں کا محاسبہ ہرگز نہیں کرے گا جو انھوں نے خود نہیں کمائی ہیں۔

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا۔ (الاحزاب ـ ۵)

نادانستہ جو بات تم کہو اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے لیکن اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا تم دل سے ارادہ کرو اللہ درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

قرآن کریم میں کچھ آیتوں سے بظاہر جبر معلوم ہوتا ہے اور کچھ آیتوں سے بظاہر اختیار معلوم ہوتا ہے۔

اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں ایک قسم کی آیتیں حقیقت کے ایک حصہ کی نمائندگی کرتی ہیں اور دوسری قسم کی آیتیں حقیقت کے دوسرے حصہ کی۔

اختیار والی آیتیں متعلق ہیں ان اعمال سے جن کا لوگوں کو مکلف بنایا گیا ہے اور زندگی میں جو تصرفات اور ان کے نتائج لوگوں کے لیے لازم ہیں۔

تخلیق، رسالت، ثواب، عذاب اور الٰہی انصاف اسی پہلو پر مبنی ہیں اور یہ عقلاً و نقلاً مسلّم بات ہے۔

اس ظاہر و باہر چیز کو نہ ماننا گویا یہ ماننا ہے کہ زندگی ایک استہزائیہ ڈرامہ اور آسمانی المیہ ہے۔

اور یہ کہ کرتا تو خود اللہ تعالیٰ ہے اور جزا یا سزا دوسروں کو دیتا ہے۔

اور یہ کہ اللہ تعالیٰ امر و نہی کے احکام جاری فرماتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ اس امر و نہی کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

اس طرح کی بات سوائے پاگل پن اور الزام تراشی کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ اللہ کی ذات اس سے بہت بلند تر ہے۔

رہیں جبر والی آیتیں تو ان کا تعلق اس بڑے عام منصوبہ سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے لیے تیار فرمایا ہے اور اس منصوبہ میں ہمارا کوئی بھی دخل نہیں۔ چاہے وہ ہمارے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ہی اس دنیا میں ہماری آمد کی جگہ و وقت کا تعین فرمایا ہے اور اسی طرح یہاں سے واپسی کا بھی۔ عقل و ذہانت کی مقدار و سطح، مزاج کی شدت یا نرمی، جسموں کی ساخت، لمبائی یا کوتاہ قامتی، خوبصورتی یا بدصورتی، شخصیات کی نوعیت، ماحول، والدین، اولاد، خون میں وراثت کے اثرات، صحت، رزق میں کشادگی یا تنگی وغیرہ۔ ان ساری چیزوں کا تعلق ظاہراً و باطناً زندگی کے مالک ہی سے ہے۔ اسی طرح اس نے ان مادی و معنوی صلاحیتوں کا بھی تعین کر دیا ہے جو اس محدود عمر میں ہماری جدوجہد کے لیے ہمیں بخشی گئی ہیں یا بخشی جائیں گی۔ پھر ہمیں جو اختیار کا پہلو دیا گیا ہے وہ ان صلاحیتوں کی فطرت سے کمیت و کیفیت کے اعتبار سے گھرا ہوا ہے۔

انسان ـــــ چاہے کچھ صلاحیت رکھتا بھی ہو ـــــ خالق نہیں ہے اور وہ ـــــ چاہے مدبر ہو ـــــ معبود نہیں ہے کہ جو چاہے کرے کتنے ہی صحیح عزم اپنی تکمیل کے وسائل کی وجہ سے پورے نہیں ہو پاتے کیونکہ وہ وسائل انسان کے بس ہی نہیں ہوتے۔

مختصر یہ کہ انسان اپنی ذمے داری کے دائرے میں آزاد بھی ہے اور اپنے پروردگار کی فرماں بردار اس وسیع کائنات کے دائرے میں غلام بھی۔

انجام

ہماری نگاہوں کے سامنے سے جنازے گزرتے ہیں اور اپنے انجام کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں ہم انھیں دیکھتے ہیں تو وقتی طور پر غم و رنج طاری ہو جاتا ہے۔

لیکن جلد ہی زندگی اپنے معمول پر آجاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ہم نے جو کچھ دیکھا تھا اسے بھول چکے ہیں پھر وہ منظر ہمارے ذہن سے بھی نکل جاتا ہے۔

بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ موت انسانی زندگی کا خاتمہ ہے اور اس کے ساتھ ہی انسان کا احساس و عقل اور اس نے جو کچھ بھلائی یا برائی کر رکھی ہے اس کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

مادہ پرست لوگ سمجھتے ہیں کہ موت زندگی کے ڈرامے کا ڈراپ سین ہے۔ اس کے بعد انسان کا کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا، ہاں کچھ دنوں تک اس کا ذکر کبھی کبھی نکل آتا ہے پھر وہ بھی فراموشی کی مٹی میں دفن ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ سب، اسلام کی نگاہ میں گمراہی اور غلط ہے۔

موت تو انسانی زندگی کے تسلسل میں ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے۔

موت کے ساتھ ہی انسان ایک دوسری دنیا میں جنم لیتا ہے جس میں اس دنیا میں اس کے کیے دھرے کا حساب ہوتا ہے۔

قبر کے عذاب کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ہماری اس دنیا میں مجرمین کے ساتھ ہوتا ہے۔

ایک مجرم پکڑا جاتا ہے، پولیس اسے اپنی تحویل میں رکھ کر ابتدائی تحقیقات کرتی ہے۔ پھر اسے عدالتی تحویل میں دے کر جیل پہنچا دیا جاتا ہے جہاں عدالتی مقدمہ کی کارروائیاں پوری کی جاتی ہیں۔

اسی طرح قبر کے ثواب کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو انعام دینے کے لیے طلب کیا جائے، وہ اپنی بہترین آرائش کے ساتھ خوش دلی سے متعلقہ دفتر تک جاتا ہے وہاں پہنچتے ہی گرم جوشی سے اس کا استقبال ہوتا ہے اور اسے عزت سے بٹھایا جاتا ہے اور پھر عزت کے ساتھ انعام اس کے حوالے کیا جاتا ہے۔

یہی عالم ارواح میں بھی ہوتا ہے۔

نیکوں کے لیے اچھا بدلہ اور بروں کے لیے سخت سزا ضروری ہے۔

قرآن کریم نے اس متوقع نعمت اور عذاب کی تصویر کشی کی ہے تاکہ لوگ زندگی اور دنیا کے دھوکے اور فتنے میں غرق نہ ہوں۔

ساتھ ہی وہ بھلائی سے حاصل ہونے والی عزت و بلندی کو یاد دلا کر بھلائی کرنے کی بار بار ترغیب دیتا ہے۔

اور برائی کے عبرت ناک نتائج کو یاد دلا کر برائی سے رکنے کے لیے بار بار ڈراتا ہے۔

لوگ اپنی اس زندگی میں بھی مادی سزاؤں سے بے نیاز نہیں ہوتے کیونکہ یہاں وہ صرف روح کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کی مادی ترکیب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جب یہاں انسانی وجود کو وہ جسمانی ہیئت اور خصوصیات حاصل ہیں جن کی بنا پر وہ مثلاً فرشتوں سے الگ حیثیت رکھتا ہے تو پھر مادی جزا و سزا کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن کریم نے متقیوں کے لیے تیار کی گئی جنت اور منکرین کے لیے تیار کی گئی جہنم کے بارے میں جو طویل گفتگو، مختلف مواقع پر اور مختلف پہلوؤں سے کی ہے اس میں یہی راز پنہاں ہے۔

اور اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان آخرت میں اپنے مادی و روحانی دونوں وجودوں کے ساتھ ہمیشہ ہمیش کے لیے رہے گا اور دوسری مخلوقات کے مقابلے میں اسے جو امتیازی خصوصیات حاصل ہیں وہ ختم نہیں ہو جائیں گی چاہے ان کی نوعیت اور حالت بدل جائے۔

اس لیے ہمیں اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھنا چاہیے۔ اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ہماری زندگی کا سلسلہ اس زمین سے رخصت ہونے کے بعد بھی چلتا رہے گا۔

ہمیں یقینی طور پر یہ بھی جاننا چاہیے کہ اس دنیا میں گناہ اور برائی کا انجام آخرت میں تباہی و بربادی ہو گا چاہے اس دنیا میں گناہ گار کو کچھ مہلت اور راحت ہی کیوں نہ حاصل ہو جائے۔

اسی طرح بھلائی اور نیکی کی جدّوجہد کرنے والا چاہے اس دنیا میں کچھ تکلیف اور تنگی ہی کا شکار رہے آخر کار بہترین انجام اس کے انتظار میں ہے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ (الانبیاء۔ ۴۷)	قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے پھر کسی شخص پر ذرّہ برابر ظلم نہ ہو گا جس کا رائی کے دانے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہو گا وہ ہم سامنے لے آئیں گے اور حساب لگانے کے لیے ہم کافی ہیں۔

آخرت بالکل حقیقی چیز ہے اور اسے کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کا مطلب دنیا سے آنکھ پھیر لینا نہیں ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے آپ مستقبل کی بات کریں اور اس کے لیے تیاری کی ضرورت پر زور دیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے حال اور اس کی ضروریات کو نظر انداز کر دیں۔

جب اس حقیقت کو ذہن میں نہیں رکھا جاتا تو نتیجہ کے طور پر اچھائی سے زیادہ خرابی پیدا ہوتی ہے اور عام ذہنوں میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ آخرت میں نجات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک آدمی دنیا میں پراگندہ حال نہ رہے جب کہ یہ زندگی کے حقائق، مادہ کے قوانین اور کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سنّت سے ناواقفیت کی بات ہے۔

بلاشبہ دین میں آخرت اور جنت وجہنم کے بارے میں بہت ساری باتیں موجود ہیں لیکن ان کا مقصد انسان کو صحیح راہ پر لانا، آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے سے روکنا اور اسے وسیع تر افق اور دائمی زندگی کی طرف متوجہ کرنا ہے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام نہ لے کر مجبوری وبے چارگی اختیار کرنا نہیں ہے۔

یہ زندگی

یہ زندگی

عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ سارے مذاہب ــــ عام طور پر ــــ زندگی کے حریف ہیں اور زندگی اپنی موجودہ علمی و عمرانی سطح تک اس کے بعد ہی پہنچنے میں کامیاب ہو سکی جب اس نے دینی تعلیمات اور اس دنیاوی زندگی کے بجائے اس کے بعد کے مراحل کے تعلق سے مذہب کے زور و اہتمام سے پیچھا چھڑالیا۔

ہمیں یقین ہے کہ کم از کم اسلام کے تعلق سے یہ بات بالکل ہی غلط ہے۔ اسلامی تعلیمات پر معمولی غور و تامّل سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایمان کی تکمیل، بہترین طرزِ فکر اور زندگی و کائنات میں عمل و سرگرمی کے درمیان مضبوط رشتے استوار ہیں۔

قرآن کریم انسان سے، دنیا کے بارے میں اس طرح گفتگو کرتا ہے جیسے کوئی بہت مالدار آدمی اپنے وسیع املاک اور عظیم وسائل کی بات کرے۔

اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔ کیونکہ انسان ــــ اسلام کی نگاہ میں ــــ اس دنیا کا بادشاہ اور مخدوم و آقا ہے۔

انسان کے بارے میں اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً۔

(لقمان ـ ۲۰)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کو اللہ نے تمہارے کام میں لگایا اور تم پر اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں پوری کر دیں۔

سورج ہمارے لیے ہی نکلتا اور ڈوبتا ہے۔

آسمانوں پر چمکتے ہوئے ستارے ہماری ہی آنکھوں کے لیے زینت اور رہنمائی کا ذریعہ بنائے گئے ہیں۔

أَأَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَآءُ بَنَاهَا
رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا وَأَغْطَشَ
لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحٰهَا وَالْأَرْضَ
بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا أَخْرَجَ مِنْهَا
مَاءَهَا وَمَرْعٰهَا وَالْجِبَالَ أَرْسٰهَا۔
مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ۔

(النازعات ۲۷-۳۰)

کیا تمہارا بنانا مشکل ہے یا آسمان کا۔ اس نے اس کو بنایا، اس کا ابھار اونچا کیا پھر اس کو برابر کیا اور اس کی رات اندھیری کی اور اس کی دھوپ کھول نکالی اور زمین کو اس کے پیچھے صاف بچھا دیا۔ زمین سے اس کا پانی اور چارا باہر نکالا اور پہاڑوں کو قائم کر دیا تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے کام چلانے کو۔

زمین کو کھیتوں سے سنوارا گیا تاکہ ہمیں غذا فراہم کریں، باغات سے سجایا گیا تاکہ ہمارے دل و دماغ اور نگاہوں کو سرور بخشیں۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے ان کی ضروریات بھی فراہم کر دیں اور تفریحات بھی۔ اور ان سب کے بعد وہ ان سے اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا کہ وہ اسے یکتا سمجھیں۔

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَ
أَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ السَّمَآءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا
بِهِ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا
كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْبِتُوا شَجَرَهَا أَإِلٰهٌ
مَعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَعْدِلُونَ۔

(النمل - ۶۰)

بھلا کس نے آسمان اور زمین بنائے اور تمہارے لیے آسمان سے پانی اتار دیا پھر اس سے ہم نے رونق والے باغ اگائے۔ تمہارا کام نہ تھا کہ ان کے درخت اگاتے اب اللہ کے ساتھ کوئی اور حاکم ہے۔؟ کوئی نہیں وہ لوگ راہ سے مڑتے ہیں۔

صحیح ایمان کی عمارت ان عناصر سے ہی مکمل ہوتی ہے جو کائنات پر غور و فکر سے حاصل کیے جاتے ہیں، اور صحیح نگاہ جس قدر ان عناصر کو حاصل کرے گی اسی قدر ایمان بڑھے گا۔ بعض لوگ اپنی جگہ پڑے رہتے ہیں وہ نہ صحیح طور پر سوچ پاتے ہیں نہ عبرت حاصل کر پاتے ہیں۔ اپنی اپنی جگہوں کے قیدی اور آنکھیں بند کیے ہوئے ایسے ہی لوگوں کو قرآن تلقین کرتا ہے کہ وہ دنیا میں گھومیں پھریں، شاید اس طرح ان کی منجمد عقلوں میں حرکت پیدا ہو اور

عظیم حقائق کے ساتھ ان کا تعلق قائم ہوسکے۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا۔ (الحج۔ ۴۶)

کیا انھوں نے ملک کی سیر نہیں کی جو ان کے دل ہوتے جن سے سمجھتے یا کان ہوتے جن سے سنتے۔

انسانوں کا رشتہ کائنات کے ساتھ جوڑنے اور کائنات کے مظاہر اور رموز و اسرار کی طرف ان کی توجہ مبذول کرانے کے تعلق سے قرآن کریم ایک مثالی کتاب ہے۔

اس نے انسانوں کی مادّی زندگی کو حسنِ عمل سے اور ان کی معنوی زندگی کو کائنات پر بہترین انداز میں غور و فکر کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ صحیح زندگی کے ساتھ لوگوں کو وابستہ کرنے کے سلسلے میں اس سے زیادہ کیا بہترین رہنمائی ہوسکتی ہے۔؟

• زمانۂ قدیم سے لوگ دین کو غلط سمجھنے، دین کے نام پر زندگی سے کشمکش کرنے، لوگوں کا تعلق زندگی سے کمزور کرنے اور دنیا کو ایک بڑا چیلنج بنانے کے امراض کا شکار ہوتے آئے ہیں۔ قرآن کریم ایسے لوگوں کی سختی سے تردید کرتا ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ۔ (النحل۔۱۱۶)

اور اپنی زبانوں کے جھوٹ بنا لینے سے مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر بہتان باندھو۔ بے شک جو اللہ پر بہتان باندھتے ہیں ان کا بھلا نہ ہوگا۔

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ زندگی بالکل بے ترتیب و انتظام چیز ہے، وہ دنیا میں اتفاقاً پیدا ہوگئے ہیں اور خود یہ دنیا بھی اتفاقاً پیدا ہوگئی تھی اس لیے جو چاہیں کریں۔ اسلام ایسے لوگوں کی ناسمجھی کو مسترد کرتا ہے اور صاف اعلان کرتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ عمر مرحمت فرمائی ہے اور اس دنیا میں بسایا ہے تو اس لیے کہ ہم اسے پہچانیں نہ کہ اس کا انکار کریں۔ اور اس کا شکر ادا کریں نہ کہ اس کی نافرمانی کریں۔ اس طرح دین زندگی کا دشمن نہیں۔ نہ زندوں کے لیے وبالِ جان ہے۔

خواہشات کی نہیں

عقل کی آزادی

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ اس کی کائنات پر غور کریں اور اس کائنات کی نشانیوں پر غور و فکر کرنے اور ان کے ذریعہ پروردگار کی حکمت عالیہ کا سراغ پانے کے لیے اپنے خیالات کو ڈھیل دیں۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ۔

(الطارق ۵-۷)

پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَعِنَبًا۔

(عبس ۲۴-۲۷)

پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے ہم نے خوب پانی لنڈھایا پھر زمین کو عجیب طرح پھاڑا پھر اس کے اندر اگائے غلے اور انگور۔

أَفَلَمْ يَنظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ۔

(ق - ۶)

اچھا، تو کیا انھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا، کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا۔ اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے۔

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ

تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے

خُلِقَتْ۔ (الغاشیہ - ۱۷) بنائے گئے۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (یونس ۱۰۱)

ان سے کہو زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو۔

اس غور و فکر کے دو پہلو ہیں:

یہ وسیع دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں بے سوچے سمجھے نہیں بنائی گئی ہے نہ اس کی تعمیر کا ساز و سامان بغیر کسی ترتیب و منصوبہ بندی کے بس ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو بہترین طور پر پیدا کیا ہے اور ساری چیزیں ——— جنھیں ہم دیکھ سکتے ہیں یا جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں ——— مرتب نظام اور حکمت سے بھرپور قوانین کے مطابق بنائی ہیں۔ کائنات کی ساری حرکات و سکنات ایک نظام کے دائرے میں ہیں جس میں کوئی خلل واقع نہیں ہو سکتا۔

ہوائیں اگر فضا میں ایک پتہ بھی اڑاتی ہیں تو اس کی بلندی و پستی ایک قانون کے مطابق ہوتی ہے۔

پانی میں جو جسم بھی ڈالا جاتا ہے اس کا ڈوبنا اور تیرنا ایک قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

زمین سے جو پودا بھی نکلتا ہے اس کا رنگ، پھل اور مزہ ایک نظام کے تحت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ۔ (الحجر - ۱۹)

ہم نے زمین کو پھیلایا، اس میں پہاڑ جمائے، اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ اگائی۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔

کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اور جس چیز کو بھی ہم نازل

(الحجر - ۲۱) کرتے ہیں مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ۔ ہم نے ہر چیز ایک اندازہ کے ساتھ پیدا کی ہے۔

(القمر - ۴۹)

پھر اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ہمیں یہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ آسمان و زمین کی ہر چیز حق کے ساتھ پیدا کی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تخلیق میں کسی تضاد، بے معنویت یا انار کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ وَمَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

یہ آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنادی ہیں۔ ان کو برحق پیدا کیا ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

(الدخان ۳۸ - ۳۹)

اب یہ لوگوں کی ذمے داری ہے کہ وہ کائنات کی کھلی ہوئی کتاب کی ورق گردانی کریں تاکہ ایسے حقائق سے آگاہ ہو سکیں جن سے ایک طرف اس دنیا کے بارے میں ان کا علم گہرا ہو دوسری طرف اس دنیا کے خالق کی عظمت پر یقین و ایمان مزید بڑھے۔

یہاں اب دوسرا مرحلہ قابلِ غور ہے۔

ابنائے آدمؑ علم و واقفیت لے کر پیدا نہیں ہوتے یا ان کے دلوں میں علم اس طرح داخل نہیں ہو جاتا جس طرح کسی خالی برتن میں پانی یا ہوا داخل ہو جاتے ہیں۔ علم و معرفت کے حصول کے لیے منظم جدوجہد، مسلسل عمل اور انتھک کوشش کی ضرورت ہے۔

ایسی کوشش جس میں انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور اس کی مادّی و معنوی خصوصیات سب شامل ہوں۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ

اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے

وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (النحل۔ ۷۸)

تھے اس نے تمہیں کان دیے، آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیے اس لیے کہ تم شکرگزار بنو۔

ہم جب پیدا ہوتے ہیں تب کچھ بھی نہیں جانتے۔ لیکن سماعت و بصارت اور غور و فکر کے وسائل کے ذریعہ تعلیم کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ ان وسائل کا پوری باریک بینی سے محاسبہ ہوگا اس لیے ان کی بے قدری نہیں کرنی چاہیے اور ان کے ثمرات کو رائگاں نہیں کرنا چاہیے۔

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ (بنی اسرائیل۔ ۳۶)

یقیناً آنکھ، کان اور دل سب کی بازپرس ہونی ہے۔

یہ انسانی صلاحیتیں اس لیے پیدا کی گئی ہیں کہ کائنات کے حقائق کے ساتھ ہم آہنگی پیدا ہوسکے، کائنات کے خزانے کھولے جاسکیں اور اس کے اسرار و رموز کا انکشاف کیا جاسکے۔

ان صلاحیتوں کا مقصد حق کو اپنانا اور زندگی کے راستے کو اس کی روشنی میں طے کرنا ہے نہ کہ باطل کا ساتھ دینا اور ہر وادی میں چکر کھانا۔

اسلامی تہذیب شروع میں مفید حقیقت کے میدان میں فکر و نظر کو کام میں لانے کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی تو اس نے خود بھی بہت کچھ فائدہ حاصل کیا اور دنیا کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچایا۔

حالیہ دور میں سائنس کی درس گاہوں نے جو بھی پیش رفت کی ہے کیا وہ پہلے کے عربوں کے فکر و نظر کی خوشہ چینی نہیں ہے۔؟



لیکن اسلام نے جہاں فکری آزادی دی وہیں خواہشات کو بے لگام نہیں چھوڑ دیا بلکہ ان کے لیے کچھ حدود و ضوابط مقرر کیے، دنیاوی خواہشات کی تکمیل کے لیے اس نے باریک بینی کے ساتھ بہت سے بند باندھے۔

انسان کی طاقت محدود ہے۔ اگر آپ اسے لہو ولعب اور بے لگام خواہشات میں ضائع کر دیں تو بھلائی و سنجیدگی کی راہ پر کیسے چلا جا سکے گا۔ پھر دنیا صحیح راستے سے بھٹکنے کے علاوہ کہاں رہ جائے گی۔

دنیا کو جو کچھ بھلائی پہنچ سکی ہے وہ فکر و نظر کی آزادی ہی سے پہنچ سکی ہے اور جو کچھ برائی ملی ہے وہ خواہشاتِ نفسانی وغیرہ ہی سے پہنچی ہے۔

ان دونوں آزادیوں کو خلط ملط کرنا مناسب نہیں ہے۔

ابنائے آدمؑ علم کے ذریعہ تو فرشتوں سے ہمسری کرتے ہیں:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ۔

(آل عمران ۱۸)

اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور فرشتے اور سب اہلِ علم بھی راستی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں۔

دیکھیے اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم کو کس درجے میں رکھا ہے۔

لیکن یہی ابنائے آدمؑ خواہشاتِ نفس اور گمراہیوں میں پڑ کر حیوان کے درجے تک گر جاتے ہیں:

اَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوَاهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔

(الفرقان ۴۳-۴۴)

کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ وہ تو جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

اسلام عقل کو حرکت میں لاتا ہے اور اس کے لیے سازگار فضا پیدا کرنے میں ہر مددگار چیز کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اسی آزادانہ فکری تحریک کے سلسلے میں قرآن کہتا ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا۔ (سبا۔ ۴۶)

اے نبیؐ، ان سے کہو کہ میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو۔

لیکن ساتھ ہی وہ خواہشاتِ نفس کو بے لگام نہیں رہنے دیتا اور اس کے انجام سے ڈراتا ہے:

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى (النازعات ۳۷-۳۹)

تو جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی دوزخ ہی اس کا ٹھکانہ ہوگی۔

اب یہ آزادی کے علم برداروں کی ذمّے داری ہے کہ وہ دونوں راستوں کے درمیان فرق و امتیاز سے کام لیں۔

مادہ و روح

اسلام انسان کے دنیاوی و اخروی مفادات کے درمیان بھی مکمل ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور انسان کے جسمانی و روحانی تقاضوں کے درمیان بھی۔

کیونکہ اسلام کی نگاہ میں انسان کو خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔

مطلوبہ کمال مادی و معنوی دونوں اعتبار سے پیش رفت کے ذریعے ہی حاصل ہوتا ہے۔

روئے زمین پر صحیح زندگی ہی بعد میں اس کی ابدی زندگی کی کامیابی کی بنیاد ہے۔ اگر یہ بنیاد ہی گر گئی تو پوری عمارت ہی منہدم ہو جائے گی۔

وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل - ۷۲)

اور جو اس دنیا میں اندھا بن کر رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ راستہ پانے میں اندھے سے بھی زیادہ ناکام۔

اسلام میں روح اور جسم کے درمیان کوئی کشمکش نہیں۔ یہ تقسیم تو انسان کی واحد حقیقت کے خلاف ہے۔

اس طرح اسلام میں دنیا و آخرت کے درمیان کوئی کشمکش نہیں بلکہ اس طرح کی تقسیم تو دین کے تعلق سے کج فہم لوگ کرتے ہیں۔

رہبانیت کے ذریعہ جسم کو مشقت میں ڈالنے یا زہد کے ذریعے زندگی کو دشمن بنالینے کی ساری باتیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہدایات کے برعکس ہیں اور اسلام کا ان سے

کوئی تعلق نہیں۔



انسان کا جسم اس کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اگر یہ جسم کمزور یا بیمار پڑ جائے تو انسان اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ نہ وہ علم حاصل کر سکتا ہے، نہ جہاد کر سکتا ہے۔ نہ خود اپنے آپ کو یا قوم کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہے۔

میں نے کسی امام کی بات پڑھی کہ ایک دن وہ ان لوگوں کی باتوں سے دھوکا کھا گئے جو جسم کو حقیر سمجھتے ہیں اور اسے مشقت میں ڈالنے کی مشق کرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے روح کے تزکیہ اور قلب کو منوّر کرنے کے لیے کھانے کی مقدار بہت کم کر دی۔ چند ہی دنوں کی کوشش کے بعد ایسا ہوا کہ وہ جو ذمّے داریاں ادا کرتے تھے ان میں بھی کوتاہی ہونے لگی اور جتنا قرآن کریم تلاوت کرتے تھے اس کی بھی سکت باقی نہیں رہی۔ تب وہ چونکے اور کہنے لگے کہ: چند لقمے چھوڑ کر وہ اپنے نفس پر وہ چیز حرام کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حلال کر رکھی ہے پھر بہت سے نیک اعمال کی ادائیگی سے بھی محروم ہو رہے ہیں۔ یہ تو شیطان کی پیروی ہے۔

بے شک طاقت ور وصحت مند جسم بڑے بڑے کام کرنے میں بہت بڑا مددگار ہے کوئی بھی عقل مند انسان جسم کو مریض و بے کار بنانے کی کوشش نہیں کر سکتا اور کوئی فریب خوردہ شخص ہی اس طرح کی بات اسلام سے منسوب کر سکتا ہے۔

ہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو طرح طرح کے کھانے گلے تک ٹھونستے رہتے ہیں اور بازوؤں کی مچھلیاں دیکھنے کے لیے ہی جسم کو پروان چڑھانے میں لگے رہتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے غلط طرزِ فکر کے علاج کی ضرورت ہے تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ ضرورت سے زیادہ کھانا ایک مرض ہے جس کا انجام خوفناک ہوتا ہے جسم کا کمال کمزور اخلاق اور کم عقلی کو عزّت نہیں بخش سکتا۔

لیکن یہ گمان کرنا کہ دین جسم کے خلاف جنگ کی دعوت دیتا ہے، اسلامی تعلیمات میں اس کی کوئی بنیاد نہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کی سیرتوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں ایک قیمتی حصہ ان تعلیمات کا ہے جن میں جسم کو صاف ستھرا رکھنے، اس کی حفاظت کرنے، اس کی ضروریات پوری کرنے اور اسے راحت پہنچانے پر زور دیا گیا ہے۔

ان تعلیمات کو نظر انداز کرنا اسلام پر زیادتی اور صحیح راستے سے انحراف ہوگا۔



دنیاوی زندگی میں توفیق ہی آخرت میں کامیابی کا واحد راستہ ہے اور توفیق کا مطلب دنیاوی زندگی میں ناکامی اور دنیا کے بازار میں دیوالیہ ہونا نہیں، بلکہ اس کا مطلب ہے دنیاوی زندگی کی باگ ڈور پر اختیار وقابو حاصل ہونا اور پھر اسے حق اور بھلائی کے لیے استعمال کرنا۔

ہم نے دیکھا ہے کہ بعض لومڑی صفت انسان زندگی میں اپنا مقصد حاصل نہیں کرپاتے تو دنیا کی برائی ومذمت کرکے ہی اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں۔

ایسے لوگوں نے مال ودولت، کائنات کے حسن وجمال، وسعت وعافیت حتیٰ کہ علم وانکشاف اور طاقت وحوصلہ مندی، سب کو حقیر بنانے کی کوشش کی۔

ایسے لوگ جب سے نمودار ہوئے ہیں اور ان کی باتیں پھیلی ہیں، ملت اسلامیہ کے لیے وبال بنے ہوئے ہیں۔

اسلام تو ایسا دین ہے جس کی بنیاد دنیا کی پہچان اور اس کے زبردست خزانوں کے حصول اور پھر انھیں حقیقت کی خدمت اور اس کی سربلندی کے لیے استعمال کرنے پر قائم ہے۔

اس میں زندگی سے کنارہ کشی وپہلو تہی اور کمزوری وناتوانی کو اچھا سمجھنے اور جدوجہد ترک کردینے کا تصور کیسے سماسکتا ہے؟

ہاں ایسے لوگ بھی ضرور پائے جاتے ہیں جو زندگی برائے زندگی کے قائل ہیں

اور اس سلسلے میں کسی بھی برائی میں پڑنے، کمزور افراد اور گروہوں کو ختم کر دینے اور جو کچھ بھی ہاتھ لگ جائے اسے ہڑپ کر لینے سے نہیں چوکتے۔

اس طرح کے مال و دولت، اولاد اور اقتدار کے پجاریوں کی مذمت کا مطلب پوری زندگی کی مذمت تو نہیں ہو سکتا۔

یہ تو سراسر حماقت ہوگی۔

قرآن کریم، غصہ و غرور، فتنہ آرائی، دنیا میں بدمست ہونے اور اس کی لذتوں میں کھو جانے کی مذمت کرتا ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَا۔

لوگو! اللہ کا وعدہ یقیناً برحق ہے لہذا دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔

(فاطر۔ ۵)

لیکن اس کا مطلب کیا زینت اور کشادگی کو حرام قرار دینا ہے؟

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ۔

(الاعراف۔ ۳۲)

اے نبیؐ! ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں۔

قرآن کریم نے مال و دولت اور اولاد کو دنیاوی زندگی کی زینت قرار دیا ہے لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ آخرت کے لیے بیکار ہیں؟

آخرت کی زندگی تو اللہ کی راہ میں دولت خرچ کرنے اور اپنی جان اور اولاد کو حق کی مدد کے لیے وقف کرنے کے ذریعہ ہی طلب کی جاتی ہے۔

کیا افراد اور دولت کے بغیر بھی جہاد ممکن ہے؟

اور کیا زندگی سے ناواقفیت اور صحیح راستے پر چلے بغیر بھی کامیابی کی توقع کی جاسکتی ہے؟

اس زندگی میں غرق مگر اس کے معاملات سے بالکل بیگانہ لوگ صرف دنیا

کے بندے ہیں جو ایمان و انصاف کے معاملات سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔

اس طرح کے دنیا کے غلام جب دین کی مخالفت کرتے ہیں تو ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دنیاوی زندگی کے سارے میدان ان کے لیے خالی ہو جائیں اور کوئی حق پرست انھیں ٹوکنے والا نہ رہ جائے۔

بہرحال اسلام ایک ساتھ روحانی اور مادّی دین ہے۔

وہ انسان کے لیے ایک معتدلانہ زندگی کی ضمانت دیتا ہے جس میں کوئی انحراف اور کوتاہی نہ ہو۔

وہ دنیا اور آخرت کی نعمت کا ایک بلند معیار قائم کرتا ہے۔

اور ہر ایسے زہد کو مسترد کرتا ہے جس سے زندگی کی نشو و نما معطل ہو جائے۔

اسی طرح ہر ایسی رہبانیت کو مسترد کرتا ہے جو جسمانی ضرورت کی تکمیل کی مخالفت کرے۔

مساوات

اسلامی تعلیمات کا پہلا نتیجہ خدا کے سوا کسی کی بھی بندگی کا انکار اور یہ احساس پیدا کرنا ہے کہ انسان کو ساری مخلوقات میں باعزت مقام حاصل ہے اور کسی بھی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے بالاتر سمجھے۔

اسلام نے بلا استثنا تمام انسانوں کو فرائض اور عام حقوق میں ایک ہی جیسی حیثیت دی ہے۔

تمام انسان اللہ کے بندے ہیں اور اس بندگی سے کوئی بھی انسان مستثنیٰ نہیں۔

إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ لَقَدْ أَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا۔ (مریم ۹۳-۹۴)

زمین اور آسمانوں کے اندر جو بھی ہیں سب اس کے حضور بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔ سب پر وہ محیط ہے اور اس نے ان کو شمار کر رکھا ہے۔

پھر سارے انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کے ناطے ایک ہی خاندان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَنِسَآءً۔ (النساء ـ ۱)

لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔

اس لیے کسی نسلی تفریق یا کسی علاقائی امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں۔

لوگوں کے حالات، صلاحیتوں اور زبانوں وغیرہ میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ خالق کائنات کی قدرت کا مظہر اور دلیل ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ۔

(الروم - ۲۲)

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمندوں کے لیے۔

اور اس فرق و اختلاف کا مقصد باہم ایک دوسرے کی پہچان اور الفت ہے نہ کہ نفرت و قطع تعلق۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔

(الحجرات - ۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔

انسانی خاندان پر جو فرائض ڈالے گئے ہیں ان سے بھی کسی غیر معذور انسان کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے اسلام فرض کردہ عقائد، عبادات اور اخلاق و معاملات سے یہ بات بالکل واضح ہے۔

مسجد میں خاص و عام بغیر کسی امتیاز کے صف باندھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے قدم سے قدم ملا کر ساتھ ساتھ سر جھکاتے ہیں۔

اس طرح عام حقوق کی ضمانت سب کے لیے ہے کسی خون کے قصاص یا کسی شرعی سزا کے نفاذ میں کسی بھی انسان کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا نہ کسی شخص کو قانون کے دائرہ عمل سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔

اسلام لوگوں کے پاس یہ مساوات لے کر اس طرح آیا تھا جیسے ایک لمبی رات کے بعد سورج طلوع ہو۔ اس سے پہلے لوگ اس عام مساوات سے آگاہ بھی نہیں تھے۔ نہ اس کے بعد ہی اس کے مقررہ معیار تک پہنچ سکے۔

ابھی ہمارے جدید دور تک دوسرے نظاموں کے زیر سایہ زندگی گزارنے والے بہت سے لوگوں کے لیے وہ حقائق تمناؤں کا درجہ رکھتے رہے ہیں جنھیں اسلام بہت پہلے پیش کر چکا ہے۔

جب اسلام آیا تو حکمراں لوگ سمجھتے تھے کہ وہ کسی دوسری مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور عوام پر ان کی حکمرانی ان کا خدائی حق ہے۔

اسلام نے اس زعم باطل کو ٹھکراتے ہوئے اپنے نبیؐ کی زبانی لوگوں سے یہ کہلوایا کہ:

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ ۔ میں تو تمہاری طرح کا ایک انسان ہی ہوں۔

(العنکبوت - ۱۰۰)

آپؐ کے بعد آپ کے خلفاء آزادانہ طور پر چنے گئے۔

پھر حکمراں نے یہ اصول بھی صاف صاف بتائے کہ:

"میں تمہارا والی بنایا گیا ہوں لیکن تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔"

اور یہ کہ "اگر تم مجھ سے بھلائی صادر ہوتے دیکھو تو میری مدد کرو اور اگر برائی صادر ہوتے دیکھو تو مجھے سیدھا کر دو۔"

اس طرح صاف اور روشن ہدایات کے ذریعہ پہلے کے بادشاہوں کا تقدس پارہ پارہ ہو گیا اور خداداد حق کے نظریہ کی بنیاد پر کسی شخص کے بادشاہ بن کر مسلط ہونے کا بھرم ٹوٹ گیا۔

انسانی معاشروں میں شریف و رذیل یا آقا و غلام جیسی غیر منصفانہ تقسیم کو اسلام ظالمانہ قرار دیتا ہے اور فطری طور پر اس کا مخالف ہے۔

مکہ مکرمہ کے دور میں اس کے اس اصول کی سخت آزمائش بھی ہو چکی ہے۔ طاقت و

اقتدار والے لوگ اسلام میں کمزور طبقہ کے لوگوں کے داخل ہونے سے پریشان تھے اور آئندہ کے لیے خوف محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہلا بھیجا کہ ان لوگوں کو اپنے پاس سے بھگا دیجیے تو ہم آپ کا دین قبول کر سکتے ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس پیشکش کو بے چوں وچرا مسترد کر دیا۔ دوبارہ پیغام آیا کہ اگر ان لوگوں کو ساتھ رکھنا ہی ہے تو پھر انھیں پچھلی صفوں میں کر دیا جائے اور ہم لوگ اگلی صفوں میں رہیں۔

جبکہ آگے تو باصلاحیت اور ایمان وعمل میں سبقت کرنے والوں کا حق تھا ابھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس پیشکش پر غور کر ہی رہے تھے کہ کیا اہلِ ایمان کو ان کے ایمان پر بھروسہ کرتے ہوئے، کچھ دنوں کے لیے پیچھے کر دیا جائے اور ان طاقتور لوگوں کو آگے قبول کر لیا جائے یہاں تک کہ جب ان کے دلوں میں ایمان پوری طرح پختہ ہو جائے تب یہ خود اپنا مغرورانہ انداز چھوڑ دیں گے۔

اتنے میں وحی نازل ہوئی کہ:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّن شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ۔

(الانعام ۵۲-۵۳)

اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں انھیں اپنے سے دور نہ پھینکو ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار ان پر نہیں اس پر بھی اگر تم انھیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گا۔ دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ آزمائش میں ڈالا ہے۔

اس طرح آسمانی ہدایت نے فیصلہ کر دیا کہ اصولوں کو ــــ محض ظاہری طور پر بھی ــــ قربان نہیں کیا جاسکتا۔ جو اسلام میں داخل ہو وہ جاہلانہ خیالات کی چادر اُتار پھینکے اور یہ نہ سمجھے کہ وہ موہوم نام نہاد خیالی امتیازات کی بنا پر کسی دوسرے سے افضل ہے۔

مساوات کے تعلق سے عورت کے بارے میں بھی اسلام کے موقف کی وضاحت ضروری ہے۔

کیا یہ صحیح ہے کہ اسلام نے مرد کے مقابلے میں عورت کو کم مرتبہ دیا ہے؟

جو لوگ اس طرح کی بات کرتے ہیں ان کی دلیل یہی ہوتی ہے کہ اسلام نے میراث میں مرد کا حصّہ عورت سے دُگنا رکھا ہے اور عورت کی گواہی اس کے نصف قرار دی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس میں مغالطہ ہے

اگر اسلام نے میراث میں عورت کا حصّہ مرد سے نصف نہ مقرر کیا ہوتا تو مساوات کا توازن ہی بگڑ جاتا اور عورت کا حصّہ زیادہ ہو جاتا۔

اور یہ اس لیے کہ اسلام نے مرد ہی پر عورت کے اخراجات کی ذمّے داری ڈالی ہے وہی شادی کی صورت میں اسے مہر بھی ادا کرتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو ذمّے داریاں مرد پر ڈالی گئی ہیں ان کی ادائیگی میں اس کا مال تو ختم ہو جائے جبکہ عورت کا مال اسی طرح برقرار رہے گا اس میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر میراث میں مرد کا حصّہ بڑھا دیا گیا ہے۔ اور یہ اضافہ صرف مادّی ذمّے داریوں کے پیشِ نظر ہے اس سے مرد کی کوئی معنوی فضیلت ہرگز مقصود نہیں۔

رہا گواہی کا معاملہ۔ تو یہ بالکل واضح ہے کہ اسلام نے عورت کا زیادہ تر کردار گھر کے اندر سے متعلق اور کم تر زندگی کے دوسرے میدانوں سے رکھا ہے اور اس طرح اسے ان ذمّے داریوں کی ادائیگی کے لیے موقع فراہم کیا ہے جن کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے

اور جو اس کی امتیازی خصوصیات سے مناسبت رکھتی ہیں۔ جیسے ماں بننا، بچوں کی تربیت و پرورش وغیرہ۔ اور یہ انسانی معاشرہ کا وہ اہم پہلو ہے جسے عورت کے علاوہ کوئی اور بحسن و خوبی پورا نہیں کرسکتا۔ (اور گواہی کا تعلق زیادہ تر گھر کے باہر کے امور سے متعلق ہے)

بس اس کے علاوہ مرد و عورت دونوں ہی ایک پیڑ کی شاخ ہیں۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ

(آل عمران۔ ۱۹۵)

جواب میں ان کے رب نے فرمایا میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں خواہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔

حقوق

لوگوں کے درمیان ظلم و زیادتی کے واقعات شروع ہی سے ہوتے چلے آرہے ہیں۔ جیسے ہی کوئی شخص اپنے آپ کو زیادہ طاقتور محسوس کرتا ہے ویسے ہی دوسرے لوگوں کو اپنی خواہش کے مطابق چلانے پر مجبور کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ جب انسان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ مادی یا معنوی اعتبار سے دوسروں سے فائق ہے، اور ذہن و کردار کی پختگی اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی، تو وہ غرور و تکبر کا شکار ہو جاتا ہے۔

دولت کے غرور اور جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ ذہنیت کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی۔

(العلق ۶ - ۸)

انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے رب کو بے نیاز دیکھتا ہے (حالانکہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے۔

مسرفانہ دولت والا معاشرہ دوسروں کو حقیر سمجھنے اور ان کی برائیاں ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اس کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:

وَیْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۣالَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ

تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے جس نے مال جمع کیا اور اسے

گن گن کر رکھا وہ سمجھتا ہے کہ ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔
(الحطمۃ ۔ ۱-۳)

اقتدار کا غرور بھی دولت کے غرور جیسا ہی ہوتا ہے اور وہ بھی دوسروں کو ان کی مرضی کے مطابق چلنے دینے کے بجائے خود اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش کرتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ۔
(ابراھیم ۱۳-۱۴)

آخر کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ "یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے۔" تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ "ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے۔"

یہی اقتدار کا نشہ و غرور لوگوں میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ دوسرے لوگ ان کے اشاروں پر ناچنے لگیں۔

لیکن کسی انسان کو یہ اقتدار آخر کیسے حاصل ہوگیا اور وہ کس طرح لوگوں کا آقا و مالک بن گیا۔؟

اس طرح کے شکنجوں سے انسان کو آزاد کرانا بہت بڑی بھلائی ہے۔ اور ان بیڑیوں کو توڑ کر ہی دولت و اقتدار کے غرور و نشہ کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے اور تمام بندگانِ خدا کی ضرورتیں پوری کی جاسکتی ہیں اور ان کی انسانی عزت و مرتبت بحال کی جاسکتی ہے۔



انسانی تاریخ میں ظلم و زیادتی کے بہت سے الم ناک واقعات نظر آتے ہیں یہاں تک کہ بہت سے قنوطیت پسند دانشور یہ کہہ اٹھے کہ ظلم انسان کی فطرت میں داخل ہے۔
اب چاہے ظلم کا رجحان انسان میں طبعی طور پر ہو یا دولت کی غلط تقسیم اور اہلِ اقتدار پر عامِ نگرانی کی کمزوری کی وجہ سے ہو، بہر حال ظلم بہت بُری چیز ہے۔

انسانیت نے ظلم وزیادتی کے شکنجوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے بڑی طویل جد وجہد کی ہے خود اسلام ظلم کا مقابلہ دو طرح سے کرتا ہے۔

۱۔ ظلم کے خلاف ڈٹ جانے، اس کی مزاحمت کرنے اور ظالموں کے سامنے سپر انداز نہ ہونے پر ابھار کر۔

۲۔ ظالموں کو ڈرا دھمکا کر، تاکہ ان سے ظلم سرزد نہ ہونے پائے، کیونکہ ظلم سے زندگی تاریک ہو جاتی ہے اور لوگوں کے دل تنگ ہو جاتے ہیں۔

اسلام ان دونوں صورتوں کو ظلم قرار دیتا ہے کہ کوئی شخص دوسرے شخص پر زیادتی کرے یا کوئی شخص اس زیادتی کو برداشت کرے۔

دین و دنیا دونوں میں ظلم کو برداشت کرنے کی گراوٹ قبول کرنے والا ظالم ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِىْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِى الْاَرْضِ۔

(النساء - ۹۷)

جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔

وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ۔

(البقرہ ۲۴۶)

بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہِ خدا میں نہ لڑیں جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیے گئے ہیں مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے اور اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۔

ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا

(ھود - ۱۱۳) ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہیں پہنچے گی۔

ان آیات میں زیادتی کو دُور کرنے پر زور دیا گیا ہے اور اسے قبول کرنا ظلم قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے ظلم پر خاموشی اختیار کرنا اور ظالموں کی ہاں میں ہاں ملانا جائز نہیں ورنہ ایسا کرنے والا شخص ذلیل ہونے کے ساتھ ساتھ خود ظالم ہو گا۔

اب رہے وہ لوگ جو دوسروں پر ظلم و زیادتی کرتے ہیں ان کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ۔

(ابراھیم - ۴۲)

اب یہ ظالم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ کو تم اس سے غافل نہ سمجھو اللہ تو انھیں ٹال رہا ہے اس دن کے لیے جب حال یہ ہو گا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں۔

اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (الشوریٰ - ۲۱)

یقیناً ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَا اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ۔

(ھود - ۱۰۲)

اور تیرا رب جب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی پکڑ ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔ فی الواقع اس کی پکڑ بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے۔

اظہارِ رائے کی آزادی

ظالموں کے ساتھ کشمکش کے سلسلے میں دنیا کو بہت سے تجربات حاصل ہوئے ہیں جنھیں بھلایا نہیں جاسکتا۔

ظالم و سرکش لوگوں کو اسی وقت چین آتا ہے جب وہ دوسروں کے منہ بند کردیں اور اپنے خلاف کوئی بات سُنے بغیر آگے بڑھتے رہیں۔

بات کرنے کی آزادی، جسے ظالم حکمراں ناپسند کرتے ہیں، لغو اور تفریحی باتوں یا بذلہ سنجیوں اور گانوں وغیرہ سے متعلق نہیں، بلکہ اس طرح کی باتیں تو وہ پسند کرتے ہیں اور انھیں اپنی راہ کی رکاوٹ نہیں سمجھتے۔

بات کرنے کی وہ آزادی جس کے عَلَم بردار اصلاح پسند ہوتے ہیں اور جسے سرکش سخت ناپسند کرتے ہیں وہ تعمیری تنقید، نصیحت و اصلاح اور ڈنڈے اور تلوار کے بجائے دلیل کے مقابلے میں دلیل پیش کرنے کی آزادی ہے۔

اسلام اس آزادی کی تفصیل اور اس کے بارے میں اپنا موقف بالکل واضح انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ تنقید و نصیحت کی آزادی کو ایسا نہیں سمجھتا کہ وہ ہر انسان کے لیے جائز ہے جب چاہے اختیار کرے اور جب چاہے چھوڑ دے۔ بلکہ معاملہ اس سے بہت زیادہ اہم ہے۔

اس طرح کے موقع پر بات کہنا جائز نہیں واجب ہے۔

یہ مسلمان پر فرض ہے کہ وہ غلطی کو خاموشی سے نہ ہونے دے۔ بلکہ اس کی روک تھام

ناگزیر ہے۔

غلطی پر تنقید اور غلط کاروں کو نصیحت کرنا واجب ہے۔

پورے معاشرے پر یہ ذمّے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ یہ ڈیوٹی انجام دے کسی غرض کے لیے نہیں، بلکہ اس لیے کہ حق کو زندہ و باقی رہنا چاہیے اور درست کو ظاہر و معلوم ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (العصر ۱ - ۳)

زمانے کی قسم، انسان درحقیقت خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا قول ہے:

اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ (بخاری) دین خیر خواہی کا نام ہے۔

اس ٹھوس بنیاد پر بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی ذمّے داری قائم ہے اور یہی امّتِ اسلامیہ کی امتیازی خصوصیت ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر اسے بہترین امّت کا درجہ حاصل ہوا۔

حق بات یقین کے سرچشمے سے نکلتی ہے۔ اگر مسلمان کے دل میں یقین کا سمندر موجیں لے رہا ہے تو وہ ہر موقعہ پر ضروری بات کہے گا۔ ہدایت یا ممانعت کی شکل میں اور نصیحت و تنقید کی شکل میں۔

اور یہ یقین جتنا کمزور ہو گا اسی قدر اس کی آواز کمزور ہو گی یہاں تک کہ اس کی سرگوشی بھی سننا دشوار ہو جائے گا۔ تاہم مسلمان کے دل میں حق کے لیے جبّت مر نہیں سکتی۔ حالات اسے خاموش کر سکتے ہیں لیکن اس کے دل میں بہر حال اس کی حقیقت جاگزیں رہے گی۔

یہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا مطلب ہے کہ:

"تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اُسے اپنے ہاتھ سے روک دے، اور اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روک تھام کرے، اور اگر ایسا بھی نہ کر سکے تو اپنے دل سے (اسے بُرا سمجھے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔" (بخاری)

یہ تو اظہار رائے کی آزادی کا ایک پہلو ہوا۔

اب رہا دوسرا پہلو ـــــ یعنی یہ کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جو چاہے کہے یا لکھے ـــــ تو اس کے بارے میں اسلام کی تعلیمات بالکل واضح ہیں۔

وہ بے مقصد باتیں بنانے کو پسند نہیں کرتا کیونکہ اس سے مفید اور سنجیدہ چیزوں سے لوگوں کی توجہ ہٹتی ہے۔

لَاخَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوَاهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ۔

(النساء ۱۱۴)

لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کے لیے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کے لیے کسی سے کچھ کہے تو یہ البتہ بھلی بات ہے۔

اور اگر بات کسی کی بُرائی اور بدگوئی پر مشتمل ہو تو اس کی اجازت نہیں اور کسی شخص کو بھی اس کی آزادی اور حق حاصل نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى۔

(المجادلہ۔ ۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں نہیں، بلکہ نیکی اور تقویٰ کی باتیں کرو۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔ (النساء ۱۴۸)

اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی برائی پر زبان کھولے الّا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ اظہار رائے کی آزادی کا مطلب بہت سے قلم کاروں نے بالکل الٹا سمجھ لیا ہے اور صفحے پر صفحے لایعنی، بیہودہ اور نقصان دہ باتوں سے سیاہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ گویا شیطان ان کے دماغوں میں گھر بنا چکا ہے اور ان کے قلموں کے ذریعہ سانس لے رہا ہے اب ان سے چغلی، غیبت، تجسس، بے حرمتی، شہوت پرستی اور رسوا کن چیزیں ہی نکلتی ہیں جو اسلام نے ممنوع قرار دے رکھی ہیں۔ دوسری طرف انھیں پڑھ پڑھ کر لوگوں کا رجحان سنجیدگی کے بجائے تفریحات اور برائیوں کی طرف بڑھ رہا ہے اور حق پرستی اور اخلاق و کردار نگاہوں سے اوجھل ہو رہے ہیں۔

تعبیر کی اس قسم کو اظہار رائے کی آزادی نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ یہ تو برائی اور تخریب کی آزادی ہے اور تمام ہی قوموں کو اس کے انجام سے ڈرنا چاہیے۔

اعتقاد کی آزادی

اعتقاد کی آزادی کا فیصلہ کرنے میں دنیا بڑی مشقتیں جھیل چکی ہے اور اس سلسلہ میں کتنی شدید معرکہ آرائی ہو چکی ہے اس کا ہم مسلمانوں کو احساس بھی نہیں ہے۔

کیونکہ اعتقاد کی آزادی ایک واضح حقیقت کے روپ میں ہمیں اپنے دین کی تعلیمات سے بھی ملی ہے اور ہمارے اسلاف کی روایات سے بھی۔

اسلام اس بات کو قطعی مسترد کرتا ہے کہ کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے وہ صرف اس بات کا قائل ہے کہ اس کے طریقِ کار کی تشریح کر دی جائے اور اس کی کتاب پڑھ دی جائے اور لوگوں کو مکمل طور پر آزاد چھوڑ دیا جائے کہ اپنی مرضی سے چاہیں تو اسے قبول کرلیں اور نہ چاہیں تو نہ قبول کریں۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا

(بنی اسرائیل ۱۰۵ - ۱۰۶)

اور اے نبیؐ، تمہیں ہم نے اس کے سوا اور کسی کام کے لیے نہیں بھیجا کہ (جو مان لے اسے) بشارت دو اور (جو نہ مانے اسے) متنبہ کر دو۔ اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھہر ٹھہر کر اسے لوگوں کو سناؤ اور اسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اتارا ہے۔ اے نبیؐ، ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم اسے مانو یا نہ مانو۔

جی ہاں آپ چاہیں تو ایمان لائیں۔
یا چاہیں تو انکار پر برقرار رہیں۔
آپ کو جو چیز پسند نہیں اسے اپنانے پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔
مطلوبہ ایمان کا واحد راستہ آزادانہ جانکاری، دل کا مکمل اطمینان اور صدق و اخلاص کے بھرپور جذبہ کے ساتھ قبول کرنا ہے۔
اسی لیے مذکورہ آیت کے بعد قرآن کریم کہتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا۔ (بنی اسرائیل۔ ۱۰۷-۱۰۹)	جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا انھیں جب یہ سنایا جاتا ہے تو وہ منھ کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں "پاک ہے ہمارا رب اس کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا" اور وہ منھ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اسے سن کر ان کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا؟
اسلام نے ایک دن بھی زور زبردستی کی حمایت نہیں کی اور نہ کبھی کرے گا کیونکہ وہ ایک چیز — اپنی تعلیمات اور قوانین کی نفاست اور معیار — پر یقین رکھتا ہے۔
وہ لوگوں سے صرف اتنا چاہتا ہے کہ عام بازار میں اسے پیش ہونے دیں تاکہ تلاش کرنے والی اور تنقیدی نگاہیں اس کا جائزہ لے سکیں۔
اگر کسی چیز کی کوالٹی اپنی طرف مائل نہیں کرتی تو نہ کوئی اس کی طرف متوجہ ہوگا نہ اسے قبول کرے گا یہی اسلام کے اس محکم قانون کا راز ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ	دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت سے

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ ۲۵۶)

انکار کرکے اللہ پر ایمان لے آیا اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

کبھی رُوئے زمین پر مختلف اسباب کی وجہ سے زندگی کی معرکہ آرائیوں میں اسلام کو بھی گھسیٹ لیا جاتا ہے اور اسے ایسی جنگ لڑنی پڑتی ہے جس کے شعلے اس کے بھڑکائے ہوئے نہیں ہوتے۔

آپ کا کیا خیال ہے اگر اسلام اس طرح کی جنگ میں فتح یاب ہو جائے اور اپنے مخالفین پر زور زبردستی کا موقع پا جائے تو کیا وہ انھیں عقیدۂ توحید قبول کرنے پر مجبور کرے گا؟

ہرگز نہیں… اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ سے فرماتا ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ۔ (التوبۃ۔ ۶)

اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کے مامن تک پہنچا دو۔

یہ نہیں فرمایا کہ جب وہ اللہ کا کلام سن لے تو اسے اپنا دین چھوڑ کر دینِ حق قبول کرنے کا حکم دو۔

نہیں، بلکہ یہ حکم دیا کہ اسے آزاد چھوڑ دو اور حفاظت کے ساتھ اس کے وطن پہنچا دو۔

اس کے بعد اگر وہ اسلام کے دائرے میں داخل ہونا چاہے تو وہ مجبوراً نہیں، اپنی مرضی سے خود آجائے گا۔

یہ چھوٹ کیوں؟ اس لیے کہ:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ۔ یہ اس لیے کرنا چاہیے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔

(التوبة - ٦)

اس لیے ضروری ہے کہ انھیں جانکاری حاصل کرنے کا پورا موقع دیا جائے۔ جب وہ دین کو سمجھ لیں گے تو اسے قبول کر لیں گے۔

جس دور میں دینی جنگیں دنیا کے مختلف حصّوں میں رائج تھیں، لوگوں کی مرضی کو کوئی بھی اہمیت نہیں دی جاتی تھی اور جبر و تشدّد کے ساتھ لوگوں کو کسی دین میں داخل کرنے کو قابلِ تحسین سمجھا جاتا تھا۔ ایسے دشوار گزار زمانہ میں لوگ اسلامی فقہ کی کتابوں میں اتنی آزادی کی بات پڑھ کر حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔

ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ لکھتے ہیں:

"آزادیٔ اعتقاد کے تعلق سے اسلام کے اہتمام اور قدردانی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ فقہاء کہتے ہیں کہ اگر کوئی ایسا بچہ کہیں مل جائے جس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو سکے کہ وہ مسلمان گھرانے کا ہے یا کافر خاندان کا، اور کوئی کافر یہ کہے کہ یہ میرا بیٹا ہے جب کہ ایک مسلمان یہ کہے کہ یہ میرا غلام ہے تو ایسی صورت میں فیصلہ بچے کی آزادی اور کافر خاندان کی فرزندی ہی کا کیا جائے گا۔"

اور یہ اس لیے کہ ایسی صورت میں اسے فوراً آزادی مل جائے گی اور جب وہ بڑا ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ کے وجود کی معرفت اور اسلام کے بہترین دین ہونے کے علم کے بعد اسلام کی دولت بھی حاصل کر سکے گا۔

یہ قرونِ وسطیٰ کی اسلامی فقہ کی کتابوں کا حکم ہے۔

جدید تہذیب کے علم بردار اب کیا کہیں گے؟

گم شدہ بچوں، سادہ لوح اور معذور لوگوں کے عقائد کے سلسلے میں وہ کیا طریقے اختیار کرتے ہیں؟

اگر اسلام پر کوئی نکتہ چینی کی جا سکتی ہے تو طرح طرح کے فتنوں اور ظلم و زبردستی سے بھری ہوئی اس دنیا میں مثالی آزادیٔ اعتقاد دینے ہی پر کی جا سکتی ہے۔

جب کہ اسلام کے پیروکار اس مذہبی تعصب کا شکار ہو کر شدید نقصان اٹھا رہے ہیں۔
تب بھی اسلام نے معاملات میں جیسے کو تیسا والا فارمولا کبھی اپنی عام پالیسی کا حصہ نہیں بنایا نہ اپنی عطا کردہ وسیع آزادیٔ اعتقاد میں کوئی کمی کرنا منظور کیا۔

اسپین کی سرزمین سے اسلام کے استیصال کے ردِّ عمل کے طور پر جب عثمانی سلطان سلیم اوّل نے ایک بار یہ کوشش کرنی چاہی کہ مصر کے غیر مسلمین کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے تو شیخ الاسلام نے اسے مسترد کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ دوسرے لوگ چاہے جو کچھ کریں آزادیٔ اعتقاد کے وسیع اسلامی طریقِ کار و نظریہ کو بدلا نہیں جا سکتا۔

اسلام تو صرف اتنا چاہتا ہے کہ آزادیٔ اعتقاد کے احترام اور اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات سے وفاداری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

مفلسی سے آزادی

فقر و فاقہ سے نجات انسان کا حق ہے۔ اور اس حق کا فیصلہ اس نے غربت و بے چارگی کی الم ناکیوں کی بنا پر کیا ہے۔

یہ انسان کا حق ہے کہ اسے ایسی ضمانتیں حاصل ہوں جو اسے اس طرح کی برائیوں سے بچا سکیں اور وہ ماضی سے سبق لے کر حال و مستقبل کا تحفّظ کر سکے۔

کاش انسان مختلف قسم کی جانکاریاں حاصل کرتا جن سے اپنے تمام معاملات میں یقین کے درجے تک پہنچ سکتا۔

اسلام انسان کو اس ناپسندیدہ فقر و افلاس سے مختلف طریقوں سے آزاد کراتا ہے۔

سب سے پہلے تو اسے اس کام کا موقع فراہم کرتا ہے جس کے لائق اسے اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے، کیونکہ یہ اس کی زندگی کی بنیاد، اس کے فائدوں کا سرچشمہ اور روئے زمین پر اس کی خلافت کے مرتبہ کو ظاہر و نمایاں کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اس نے اس زمین کو اس لیے بنایا ہے کہ لوگ اس سے فائدہ حاصل کریں اور اس میں وافر مقدار میں موجود مختلف خزانوں کو نکال کر ان سے بہرہ اندوز ہوں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۙ لِتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا

(نوح - ۱۹ - ۲۰)

اور اللہ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو۔

هُوَالَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلاً فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِھَا وَکُلُوْا مِنْ رِّزْقِہٖ (الملک۔ ۱۵)

وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تابع کر رکھا ہے چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق۔

وَھُوَالَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْکُلُوْا مِنْہُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْہُ حِلْیَۃً تَلْبَسُوْنَھَا وَتَرَی الْفُلْکَ مَوَاخِرَ فِیْہِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ۔ (النحل۔ ۱۴)

وہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے تر و تازہ گوشت لے کر کھاؤ اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنھیں تم پہنا کرتے ہو تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔

وَلَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ۔ (الاعراف۔ ۱۰)

ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لیے سامانِ زیست فراہم کیا مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔

قرآن کریم میں بہت سی ایسی آیتیں ہیں جو انسان کو اس کے وسیع اختیارات اور اس کے عظیم ورثہ کے سرچشموں سے باخبر کرتی ہیں۔ اب انسان اور تونگری کے درمیان آخر کونسی رکاوٹ درست ہو سکتی ہے۔؟

تونگری، طاقت اور اختیار کا اولین ذریعہ اور کنجی یہ ہے کہ لوگ رزق و برکت کی ان ساری چیزوں کو تصرّف میں لائیں جو ان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں اور جنھیں قدرت نے ان کے لیے فراہم کیا ہے۔

جو ان خزانوں سے آنکھیں بند کرے یا ان سے فائدہ ہی نہ اٹھا سکے تو یقیناً فقر و فاقہ ہی اس کے حصّے میں آئے گا۔

دولت کا راستہ انسان کی صلاحیتوں اور اس کائنات کی فطرت کے درمیان تعلق پیدا کرنے سے شروع ہوتا ہے اور جب یہ تعلق قائم ہو جاتا ہے تو بھلائی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

یہ افراد کی بھی ذمّے داری ہے اور جماعتوں کی بھی کہ وہ اس ناگزیر تعلق کو قائم کرنے میں باہم تعاون کریں۔

کسی کی یہ بات قبول نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے آپ کو فقیر سمجھے اور کوئی کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی دستِ سوال دراز کرے۔

یہ کتنی حیرت ناک بات ہوگی کہ ان معاشروں میں جہاں کام کرنے والوں کی کمی ہے کوئی طاقت رکھنے والا آدمی بھیک مانگے؟

لیکن کیا اس سے بھی زیادہ حیرت ناک بات یہ نہیں کہ مشرق کی پوری پوری قومیں دوسروں سے مدد مانگتی پھرتی ہیں جبکہ ان کے قدموں کے نیچے دولت کے خزانے بھرے پڑے ہیں جن سے غربت ختم کرکے خوشحالی حاصل کی جاسکتی ہے۔؟

لیکن ہمتوں کی پستی اور کردار کا بحران ہر چیز میں افلاس اور البیہ تک لے جاتے ہیں۔

اسلام کاہلی اور کم عقلی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اس غربت کو قابلِ حقارت اور اس طرح کی صورت میں بھیک مانگنے کو جرم قرار دیتا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے منقول ان احادیث پر غور کیجیے تو آپ کو خود یقین آجائے گا:

"اوپر والا (دینے والا) ہاتھ نیچے والے (مانگنے والے) ہاتھ سے بہتر ہے" (بخاری)

"ہاتھ تین قسم کے ہیں سب سے بلند ہاتھ اللہ تعالیٰ کا ہے اس کے بعد دینے والے ہاتھ کا مرتبہ ہے اور مانگنے والے کا ہاتھ قیامت کے دن تک نیچا رہے گا اس لیے جہانتک ہوسکے مانگنے سے بچو" (حاکم)

"تم میں سے کوئی شخص مانگتا رہا تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے چہرے پر کچھ بھی گوشت نہیں ہوگا" (بخاری)

"جس نے کوئی چیز مانگی جبکہ اس کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا تو وہ چیز قیامت کے دن اس کے چہرے پر ہوگی" (احمد)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک انصاری رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور صدقہ مانگا۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تمہارے گھر میں کوئی چیز نہیں؟

اُس نے کہا: ایک چادر ہے جسے ہم اوڑھ لیتے ہیں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا: دونوں چیزیں میرے پاس لے آؤ۔

وہ دونوں چیزیں لے آئے تو آپؐ نے انھیں ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ: ان چیزوں کو کون خریدتا ہے؟

ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہؐ میں ایک درہم میں لے لوں گا۔

آپؐ نے فرمایا: ایک درہم سے زیادہ کون دیتا ہے؟ (آپؐ نے دو تین بار دہرایا)

ایک شخص نے کہا: میں دو درہم میں لے لوں گا۔

آپؐ نے اس سے دو درہم لے کر انصاری کو دیے اور فرمایا: ایک درہم سے کھانے کی چیزیں خرید کر گھر والوں کو پہنچا دو اور دوسرے درہم سے ایک کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔

انصاری کلہاڑی لے کر آئے تو آپؐ نے خود اپنے دستِ مبارک سے اس میں دستہ لگایا اور فرمایا جاؤ لکڑیاں کاٹ کر بیچو میں پندرہ روز تک تمہیں نہ دیکھوں۔

انصاری کے پاس کچھ بھی نہیں تھا لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے گھر کا وہ معمولی سامان نیلام کر کے اس کی قیمت سے کلہاڑی لے کر رزق کمانے کا ذریعہ بنایا اور مانگنے کی اجازت نہیں دی۔

اور پھر آپؐ نے فرمایا: "یہ اس سے بہتر ہے کہ بھیک مانگو کہ قیامت کے دن تمہارے چہرے پر بدنما داغ بن جائے۔"

بھیک مانگنے کی اجازت صرف ایسے شخص کو ہے جو انتہائی فقر و فاقہ کا شکار ہو اور اسے دور کرنے کا کوئی اور راستہ نہ پا سکے یا پھر قرض کے بوجھ نے اس کی کمر توڑ رکھی ہو یا پھر خوں بہا کی ادائیگی میں بے بس ہو چکا ہو (ابو داؤد)

اب سوچیے ان قوموں کے بارے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم کیا ہوگا جو ایسے علاقوں میں آباد ہیں جہاں بہترین خزانے دفن ہیں لیکن وہ انھیں نکال کر فائدہ اٹھانے کے بجائے یہاں وہاں مدد کی بھیک مانگتی پھرتی ہیں؟

غربت سے نجات سب سے پہلے فطری وسائل کے ساتھ انسانی جدوجہد کو جوڑنے پر منحصر ہوتی ہے۔

اور مختلف کاموں کے ذریعہ مال و دولت کمانا لوگوں کے اخلاق و کردار، ان کے عام تعلقات، ان کے سماجی روابط اور ان کے سیاسی حالات پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔

اقتصادی حالات کے جو اہم نفسیاتی نتائج نکلتے ہیں انھیں کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام چونکہ انسان کی گہرائیوں کے ساتھ ربط رکھتا ہے اس لیے وہ زندگی کے معاملات میں پوری طرح دخل دیتا ہے۔

تب وہ انسان کے سب سے اہم مسئلہ، اس کے بدن کی سب سے شدید ضرورت اور اس کی روح کی گہرائیوں تک اثرانداز ہونے والے معاملہ سے غافل رہ سکتا ہے؟

اس لیے اسلام ایسے قواعد و ضوابط دیتا ہے جن سے اس کی اقتصادی پالیسی واضح ہو، اور وہ دائرہ روشن ہو کر سامنے آئے جس کے حدود میں انسان کو زندگی گزارنی چاہیے۔

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی معیشت کا مقصد ایسا مثالی معاشرہ قائم کرنا ہے جس سے ساری دنیا کو فائدہ پہنچے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دولت کا ایک بلند سماجی کردار ہے جسے ہرگز اس سے جدا نہیں کیا جاسکتا نہ کسی کو بھی اس کے اس کردار کو مسخ کرنے اور اس کے عام فائدہ کو روکنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

یہ ریاست کی ذمے داری ہے کہ مندرجہ ذیل نظریات اور اصولوں کی روشنی میں حالات کو استوار کرے۔

۱۔ دولت میں اس فرد سے پہلے جس نے اسے کمایا ہو، اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور

اجتماعی ادارہ ہی اس اعلیٰ حق کے تصرّف کی نمائندگی کرتا ہے اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ:

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ۔ (الحدید۔ ۷)
اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔

آتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْ آتَاكُمْ۔ (النور۔ ۳۳)
اور ان کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔

۲۔ معاشرے کے کسی ایک گوشہ میں دولت کا ارتکاز جائز نہیں کیونکہ اس سے سماجی و اخلاقی توازن میں خلل پیدا ہوتا ہے۔

جبکہ عام توازن کو برقرار رکھنا چاہیے۔

یہی دولت کو گردش میں رکھنے کا اصول ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ماخوذ ہے۔

كَيْلَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ۔ (الحشر۔ ۷)
تاکہ وہ تمہارے مالداروں کے درمیان ہی نہ گردش کرتی رہے۔

۳۔ اخوت ایک سماجی نظام ہے لیسے شدید فرق کو نمودار ہونے کی اجازت نہیں دی جاسکتی جو ایک قوم کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دے اور اخوت ایک حقیقت کے بجائے محض خواب و خیال بن کر رہ جائے۔ اس طرح کے فرق کی طرف لے جانے والے ہر مالی تفاوت کی روک تھام کی جائے گی۔

۴۔ کام ہی کمائی اور ترقی کی بنیاد ہے۔ اگر ایسے حالات محدود ہوں جن میں ایک شخص بغیر ظاہری جدّوجہد کے کھائے ـــــ مثلاً بعض صورتوں میں وراثت سے حاصل شدہ دولت کی وجہ سے ـــــ تو اس طرح کی خاص صورت کو معاشرے میں عام ہونے کی اجازت نہیں دی جاسکتی تاکہ کچھ لوگوں میں بے روزگاری کا مستقل چلن نہ ہو جائے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔
ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں تاکہ اللہ ان کے کیے کا پورا پورا بدلہ

(الاحقاف - ۱۹) ان کو دے ان پر ظلم ہر گز نہ کیا جائے گا۔

اور حدیث میں آتا ہے:

مَنْ أَبْطَأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ (مسلم) جس کا عمل سست گام ہو اس کا نسب اس کی تلافی نہیں کرسکتا۔

۵۔ حلال کمائی ہی احترام اور برقرار رہنے کے لائق ہے جو حلال نہیں اسے اس کے اصل مالکوں کے لیے، یا غیر معمولی حالات میں معاشرے کے لیے ضبط کرلیا جانا چاہیے۔

۶۔ سود ممنوع ہے، ذخیرہ اندوزی ممنوع ہے اور مشکوک استحصال ممنوع ہے۔

۷۔ قابلِ کاشت زمین کے تعلق سے اصول یہ ہے کہ ناجائز طریقے سے اس کی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ جو اسے کاشت کرے گا اسی کے پاس برقرار رہے گی جو اسے بیکار چھوڑ دے گا اس کے پاس نہیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت میں ہے کہ:

"بندے خدا کے بندے ہیں اور ملک خدا کے ملک ہیں"۔ (ابوداؤد)

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ۔ (الاعراف - ۱۲۸) زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔

زمین کی وراثت یا ملکیت اسی کے لیے ہوتی ہے جو اسے آباد کرے اور قوم کو اس کے پھل سے فائدہ پہنچائے۔ ایسا کرنے والا ہی بیکار بیٹھنے والوں کے مقابلے میں زیادہ حقدار ہے۔

۸۔ اسلام نام ہے کچھ مخصوص فضیلت کی چیزیں حاصل کرنے اور کچھ متعین قابلِ حقارت چیزوں کو چھوڑنے کا۔ اب جو مادّی وسائل بھی فضیلت کی ان چیزوں کے حصول اور قابلِ حقارت چیزوں کے چھوڑنے میں معاون ہوں ریاست پر ان کی فراہمی کی ذمّے داری ہے اور معاشرہ انھیں آسان بنانے کا ذمّے دار ہے۔

۹۔ اسلام کا ایک متعیّن بلند مقصد اور پیغام ہے۔ اس پیغام کی ادائیگی یہ تقاضا کرتی ہے کہ ریاست عام اقتصادی حالت کی نگرانی کرے یا کم از کم اقتصادی وسائل کی فراہمی اور ان کے ثمرات کے سلسلے میں اس طرح کے اقدامات کرے جو اس پیغام کی ادائگی کی ضمانت

دے سکیں۔

غالباً ان اصولوں سے ان بنیادی خطوط کی نشاندہی ہوگئی ہوگی جو اسلام نے قوم کی مالی حالت کے تعلق سے کھینچے ہیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اسلام نے سب سے پہلے کس طرح کمانے اور رزق کے حصول کی جدّوجہد پر زور دیا ہے۔

پھر اقتصادی میدان میں انسانی سرگرمیوں پر کس طرح نگرانی قائم کی تاکہ حق کا تحفّظ ہوسکے اور باطل کالعدم ہو جائے۔

ان سب کے باوجود بھی کچھ لوگ لاچاری کا شکار ہو سکتے ہیں۔

دنیا میں کوئی ایسا خودکار نظام نہیں پایا جاتا جو جنگ یا امن کے زمانے میں کم یا زیادہ انسانوں کو پریشان حالی کا شکار ہونے سے روک سکے۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام امکانی شگافوں کو بند کرتا ہے اور طاقت و صلاحیت رکھنے والوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ معذوروں کو تھام لیں اور انھیں کم سے کم اتنا خرچ ضرور فراہم کریں جس سے ان کی تکلیف کا سدِّباب ہو جائے۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

(البقرہ ۲۱۹ - ۲۲۰)

وہ پوچھتے ہیں ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں کہو جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ (عفو) ہو اس طرح اللہ تمہارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔

اور یہ "عفو" کیا چیز ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو آدمی اور اس کے خاندان کے ضروری خرچ سے زیادہ ہو۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مُراد بہترین اور حلال ترین مال ہے۔

بہرحال دونوں صورتوں میں مقصد ضرورت مندوں کو اتنی مدد پہنچانا ہے جس سے ان کی حالت درست ہو جائے اور وہ بھی پاک مال سے نہ کہ گری پڑی اور بیکار چیزوں سے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

"جس کے پاس سواری زیادہ ہو وہ اسے دیدے جس کے پاس سواری نہ ہو۔ جس کے پاس زادِ سفر زیادہ ہو وہ اسے دے دے جس کے پاس زادِ سفر نہ ہو" (مسلم)

حدیث کے راوی حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ مال و دولت کی مختلف قسموں کا نام لیتے رہے یہاں تک کہ ہم نے یہ خیال کیا کہ ہم میں سے کسی شخص کو ضرورت سے زیادہ کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں ہے۔

قرآن کریم میں انفاق (خرچ کرنے) کی آیتیں ستر سے زیادہ ہیں جن سے خرچ اور سخاوت کا لامتناہی احساس پیدا ہوتا ہے۔

اسلام جہاں اس انفاق کے ساتھ ضرورت مند پر رحم اور کمزور کے ساتھ نیکی کے پہلو کو ابھارتا ہے وہیں خرچ کرنے والوں کو یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ اس خرچ کا پھل لوٹ کر خود انھیں کو ملے گا۔

وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ ۔ (البقرہ - ۲۸۲)	اور راہِ خیر میں جو مال تم لوگ خرچ کرتے ہو وہ تمہارے اپنے لیے بھلا ہے۔
وَمَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِ ۔ (محمد - ۳۸)	جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے۔

اور یہ بدلہ آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملے گا۔

اور وہ اس طرح کہ معاشرے میں باہم محبت و شفقت اور ہم آہنگی پیدا ہوگی اور حسد اور دشمنی کے جذبات ختم ہو جائیں گے۔ اور یہ ایسی بھلائی ہے جس کے سایے میں غریبوں سے پہلے دولت مند ہی چین لیں گے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دین لوگوں کے ذہن ماؤف کرنے والا نشہ ہے ان کے لیے ہم یہاں مشہور فقیہ ابن حزم کا فتویٰ نقل کریں گے :

ضرورت مند مسلمان اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے لڑے گا اور جب تک کسی بھی مسلمان کے پاس اس کی اپنی ضرورت سے زیادہ کھانا موجود ہے۔ ضرورت مند مسلمان

کے لیے مردار کھانا مباح نہیں۔ اب اگر لڑتے ہوئے ضرورت مند مسلمان قتل ہوگیا تو خون بہا اور قصاص اس کے قاتل سے لیا جائے گا اور اگر روکنے والا قتل ہوگیا تو اس پر خدا کی لعنت ہوگی کیوں کہ وہ ایک حق کو روک رہا تھا اور اس کی حیثیت باغی گروپ جیسی ہوگی کہ:

فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ۔ (الحجرات - ۹)

پھر اگر ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔

اور حق کو روکنے والا اپنے بھائی کے خلاف بغاوت کا مجرم تھا۔

کیا اسلام کی پیش کردہ ان ضمانتوں سے بڑھ کر بھی فقر و فاقہ سے نجات دلانے والی کوئی دوسری ضمانت پائی جاتی ہے؟

خوف سے آزادی

خوف سے آزادی ہمیشہ سے انسان کی تمنا رہی ہے لیکن اس حق کا مطالبہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سامنے آیا اس کے بعد یہ ان بنیادوں میں شامل ہوگیا جن پر اقوامِ متحدہ اور سلامتی کونسل کا قیام عمل میں آیا۔

ظاہر ہے یہ ایک شریفانہ نظریہ ہے۔

آخر روئے زمین کے مختلف گوشوں میں امن وسکون کا دَور دَورہ کیوں نہ ہو؟

بین الاقوامی تعلقات میں دھمکی، جارحیت اور دہشت گردی کا ازالہ کیوں نہ ہو؟

جب ہر فرد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے شہر میں دن میں آزادانہ گھومے پھرے اور رات میں سکون کے ساتھ اپنے گھر میں آرام کرسکے، اسے نہ ہتھیار لے کر چلنے کی ضرورت پڑے اور نہ کسی حملے کا ڈر ہو۔ ریاست کی بیداری اور قانون کی بالادستی ہر جگہ امن واَمان کے تحفظ کی ضامن ہو۔ تو پوری دنیا میں ایسا ہی ماحول کیوں نہ ہو کہ کوئی قوم دوسری قوم کی جارحیت سے خائف نہ ہو، نہ کوئی کمزور ملک کسی طاقتور ملک سے ہراساں رہے اور نہ کوئی سیاہ فام نسل سفید فام نسل سے ڈرے۔

بلاشبہ یہ ایک حسین خواب ہے۔

کاش انسانی معاشرہ اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے باہم تعاون کرتا اور پھر اس کی ٹھنڈی چھاؤں سے لطف اندوز ہوتا۔

اسلام یہی چاہتا ہے کہ روئے زمین پر اس طرح کا امن واستحکام قائم ہو۔

لیکن کیا بدقماش لوگوں کی مجرمانہ ذہنیت ختم ہو سکتی ہے اور کیا ہزاروں لوگ گناہ اور جارحیت کے سلسلے میں تعاون کرنے سے شرمانے لگیں گے ؟

بہرحال خوف سے آزادی اسلام کا ایک بنیادی مقصد ہے۔

اعتماد اور مفاہمت کی فضا ہی میں یہ دین پروان چڑھ سکتا ہے اور یہی فضا وہ دوسروں کے لیے بھی فراہم کرنا چاہتا ہے چاہے اصولی و نظریاتی طور پر ان سے کتنا ہی اختلاف اور دوری کیوں نہ ہو۔

اسلام ذہن و اختیار پر دباؤ ڈالنے کو مسترد کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ایمان کی بنیاد مکمل فکری آزادی پر قائم کرتا ہے وہ انسان کے دماغ میں یقین پیدا کرنے کے سلسلے میں عقل کی صلاحیتوں کو دبانے کے لیے غیر معمولی خرقِ عادت چیزوں کا سہارا نہیں لیتا۔

جب مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے وجود اور رسالت کی تصدیق کے لیے کسی معجزے کا مطالبہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی :

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

(الشعراء ۴ - ۸)

ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں۔ ان لوگوں کے پاس رحمٰن کی طرف سے جو نئی نصیحت بھی آتی ہے یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اب کہ یہ جھٹلا چکے ہیں عنقریب ان کو اس چیز کی حقیقت (مختلف طریقوں سے) معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے ہیں اور کیا انھوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا کی ہیں۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے۔

کائنات کی نشانیوں پر غور و فکر سے ہی سچا ایمان تشکیل پاتا ہے۔

جو اپنی عقل کا احترام کرتا ہو اسے ایمان کے لیے خرقِ عادت چیزوں کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔

یہ عقلی ایمان کے بارے میں مسلمانوں کے احترام ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ اس پر بحث کرنے لگے کہ کیا روایتی طور پر ایمان لانے والوں کے ایمان کی کوئی قیمت ہے؟ اور کیا قیامت کے دن ایسا ایمان کام آئے گا۔

جس طرح اسلام نے ایمان لانے کے لیے، ذہن و فکر پر دباؤ ڈالنے کو مسترد کیا ہے اسی طرح ارادہ و اختیار پر دباؤ ڈالنے کو بھی مسترد کیا ہے۔ بھلائی کی نیت ہی قابلِ اعتبار ہے جیسا کہ آزادیٔ اعتقاد کے سلسلے میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

مذکورہ حقائق کے پیش نظر ہم کہتے ہیں کہ: اسلام دینی جنگوں سے واقف نہیں۔ وہ اپنے اصولوں کی نشر و اشاعت اور لوگوں کو اپنے دائرے میں داخل کرنے کے لیے کبھی حملہ نہیں کرتا۔

پہلی و آخری منطق دل سے قائل کرنا اور ایسی فضا میں اطمینانِ قلب ہوتا ہے جس پر ہر طرح امن و سکون کا غلبہ ہو۔

اسلام صرف دو ہی صورتوں میں جنگ کی اجازت دیتا ہے:

جو لوگ اسلام اور مسلمانوں کا قلع قمع کرنے اور انھیں ذلیل کرنے کے لیے جارحیت کریں ان کی جارحیت کو پسپا کرنے کے لیے۔

یا پھر کسی علاقہ میں ظلم و سرکشی کے شکنجوں میں سسکتی، کراہتی انسانیت کو مدد پہنچانے کے لیے۔

اور دونوں صورتوں میں ــــ فتح یابی کی حالت میں ــــ وہ اپنے آپ کو کسی فرد یا ملک پر مسلط نہیں کرتا۔

وہ صرف جارحیت پسندوں کی کمر توڑ دیتا ہے پھر لوگوں کو آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ عقائد پر برقرار رہیں۔

○

جوآپ سے صلح کرنا چاہے آپ اس سے صلح کرلیں اور جوآپ سے جنگ کرے آپ اُس کا مقابلہ کریں تو کیا آپ کو تشدّد پسند کہا جائے گا۔؟

قرآن کریم فرماتا ہے:

لَا یَنْہٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔ اِنَّمَا یَنْہٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ وَظٰھَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ۔

(الممتحنہ ۸ ـ ۹)

اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔

ظاہر ہے یہ میرا حق ہے کہ جو مجھے تنگ کرے میں اس سے کنارہ کشی کروں اور جو میرا برا نہ چاہے اس سے دوستی کا رشتہ استوار کروں۔ اس اصول میں آخر کیا چیز قابلِ اعتراض ہے؟



اسلام اور بت پرستی کے درمیان زبردست خلیج کے باوجود، اسلام نے اس سے جنگ نہیں کی بلکہ بت پرستوں سے یہی کہا کہ:

لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ

(الکافرون۔)

تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔

پھر جب جنگ بھی کی تو بت پرستی کو نیست و نابود کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف اس کی حد سے بڑھی ہوئی جارحیت کی کمر توڑنے کے لیے۔ اسلام نے یہودیت سے بھی جنگ نہیں کی بلکہ ان یہودی گروہوں سے جنگ کی جو اس پر حملہ آور ہو رہے تھے جب

ان کی جارحانہ صلاحیت ختم ہوگئی تو پھر یہودی امن وسکون سے رہنے لگے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس ہی رہن تھی اور اس میں آپ کو کسی طرح کا خدشہ محسوس نہیں ہوا۔

یہی اسلامی مزاج وفطرت آج تک مسلمانوں کے خون میں گردش کر رہی ہے۔

فلسطین کے عربوں کے ساتھ یہودیوں نے کیا کیا وحشیانہ سلوک نہیں کیا لیکن مسلمانوں نے کسی ملک میں یہودی مذہب کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں کیا اور یہودی مذہب اور جارحیت پسند یہودیوں کے درمیان فرق ہمیشہ برقرار رکھا۔ اور یہی کہتے رہے کہ ہم صرف صہیونیوں سے برسرِ پیکار ہیں جن سے حضرت موسیٰؑ اور توریت بری الذّمہ ہیں۔

حضرت موسیٰؑ مسلمانوں کی نگاہوں میں اپنے پیغمبر حضرت محمدؐ کے بھائی ہیں ان پر آسمانی کتاب نازل ہوئی جس پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس کا تحسین آمیز تذکرہ موجود ہے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ۔

(المائدہ ۴۴)

ہم نے توراۃ نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی سارے نبی جو مسلم تھے اس کے مطابق ان یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔ اور اسی طرح ربّانی اور احبار بھی (اس پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے) کیونکہ انھیں اللہ کی کتاب کی حفاظت کا ذمّے دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے۔

مسلمان کبھی اس خطِ مستقیم سے منحرف نہیں ہوئے جبکہ طرح طرح کے نامساعد حالات ان کے سامنے آتے رہے مثلاً فرانس الجزائر میں متعصّبانہ جنگ کی آگ بھڑکاتا رہا اور جنرل ڈیگال کو (۱۹۶۲ء میں الجزائر کی آزادی سے پہلے) یہ کہتے ہوئے ذرا بھی شرم محسوس نہیں ہوئی کہ الجزائر کے ۹ لاکھ مسلمانوں کے ساتھ جنگ جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ پُرانے کینے صدیاں گزر جانے کے باوجود ٹھنڈے نہیں پڑے۔

دوسری طرف مسلمان صرف یہ کہتے رہے کہ یہ ہمارے خلاف فرانسیسی نوآبادکاروں کی جنگ ہے۔ عیسائی مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہیں جوڑا۔

کیونکہ مسلمان دینی جنگوں سے آگاہ ہی نہیں۔ نہ ان کی روایات و مزاج میں یہ کبھی شامل رہی ہیں نہ کبھی ہوں گی۔

جنوبی افریقہ کے ایک سابق سفید فام صدر یہ بیان دے چکے ہیں کہ ان کی حکومت عیسائی حکومت ہے اور وہ نسلی امتیاز کی پالیسی پر اس لیے گامزن ہیں کہ افریقی سیاہ فاموں اور اسلام کے لیے مستقبل کے دروازے نہ کھلنے پائیں۔

مان لیجیے کوئی طاقت وہاں پہنچ کر مظلوم سیاہ فاموں کو آزاد کراتی تو کیا اس طاقت کو عیسائیت کے خلاف جارحیت کا مرتکب قرار دیا جاتا یا یہ واقعی صورت تسلیم کی جاتی کہ اس طاقت نے کچھ ظالموں کے احمقانہ شکنجوں سے انسانیت اور عیسائیت دونوں کو نجات دلائی۔

مسلمانوں نے ہمیشہ یہی چاہا کہ وہ ظالمانہ طاقت کی کمر توڑ دیں اور مظلوم عوام کے ہاتھوں کو بیڑیوں سے آزاد کر دیں۔

کوئی سوال کر سکتا ہے کہ عرب اپنے جزیرہ نما سے نکل کر شمالی افریقہ فتح کرنے کیوں گئے۔

لیکن اس سے پہلے اس سوال کا جواب ضروری ہے کہ اس سے پہلے ان علاقوں میں رومی نوآبادکار اور غاصب بن کر کیوں آئے تھے؟

مسلمانوں نے رومیوں کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا تھا جو پولیس والے دنگا فساد کرنے والوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

کاش آج سلامتی کونسل پہلے دور کے عربوں کے اس بلند طرزِ عمل کو اپنانے والے کچھ لوگ پا جاتی۔

دنیا کے مختلف حصوں میں ہزارہا کمزور و مظلوم انسان خوف سے آزادی کا حق پانے کے لیے ترس رہے ہیں۔

پھر ماضی کو ہر دم یاد رکھنا ہی کیا ضروری ہے؟

ہر مذہب کے ماننے والوں میں ایسے لوگ ہوتے رہے جنھوں نے اس کی بلند روح کو پامال کیا اور اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے اس کا استحصال کیا۔

جو کچھ گزر چکا اس پر لعنت ملامت سے کیا فائدہ ہوگا۔ آخر آج کیا چیز اس سے روک رہی ہے کہ دنیا کا نظام ایسی نئی بنیادوں پر قائم کیا جائے جن سے مشرق و مغرب ہر جگہ امن و سکون کا دور دورہ ہو جائے؟

ہم امن چاہتے ہیں اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے ایک محفوظ مستقبل کے خواہاں ہیں لیکن کیا استعمار کے بقا کے ساتھ' انسانی حقوق کو نظر انداز کر کے لوگوں کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کے حق سے محروم کر کے اور اسلام کا چراغ گل کرنے اور مسلمانوں سے زندگی کا حق چھیننے کی زبردست کوششوں کے ساتھ پائدار بنیادوں پر امن قائم ہو سکتا ہے؟

مسلمان خوف سے آزادی کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں اور دوسروں سے بھی اس سلسلہ میں تعاون کے خواہاں ہیں۔

ایمان و عبادات

ایمان:

انسانی زندگی کی نمودِ نَو

بہت سے لوگوں کا جو تصور ہے، ایمان اس سے بلند تر چیز ہے۔
یہ کسی شخص کے بارے میں ایک رائے قائم کرنے، کسی مسئلہ کے بارے میں کوئی حکم لگانے، کسی فلسفہ کو ماننے یا کسی طرح کے نفسیاتی رنگ میں رنگنے کا نام نہیں۔
یہ ایک سنجیدہ معاملہ کا نام ہے خدائے زندہ و کارساز کے ساتھ۔ یہ ایک ایسے تعلق کا نام ہے جو انسان کے ظاہر سے لے کر اس کے دل کی گہرائیوں تک کو مربوط کرتا ہے۔ اس ذات کے ساتھ جو اسے عدم سے وجود میں لائی اور اس کی پرورش و پرداخت کا انتظام کر کے اسے برباد ہونے سے بچا لیا۔
جس طرح ایک بیکار شخص جب نئے کام میں لگتا ہے تو اس میں اس کے اوقات ہی نہیں صرف ہوتے بلکہ اس کے ذریعے وہ اپنے حال و مستقبل کا تحفظ بھی کرتا ہے۔ اسی طرح جب انسان ایمان کے دائرے میں داخل ہوتا ہے تو وہ دن رات اپنی نئی ذمّے داریوں میں مشغول رہتا ہے اور ان سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے وسائل اختیار کرتا ہے۔

قرآن کریم واضح طور پر بتاتا ہے کہ الٰہی دعوت سے پہلے لوگوں کی مثال مُردوں جیسی ہوتی ہے اور رسولوں کی اطاعت و پیروی ان کے دلوں، ان کے افکار و نظریات، ان کے اخلاق و کردار اور ان کے طریقِ کار کے تعلق سے ایک نئی صبح بن کر طلوع ہوتی ہے۔
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا   اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ اور اس کے

لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ۔ — رسول کی پکار پر لبیک کہو جبکہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے۔ (الانفال - ۲۴)

حقیقی زندگی گوشت اور خون کی ظاہری شکل کا نام نہیں نہ وہ اعضائے بدن کی حرکت وطاقت کا نام ہے۔ اس طرح کی زندگی میں تو انسان کے ساتھ جانور بھی شریک ہوتے ہیں اور شاید انسان سے زیادہ ہی حصہ لیتے ہیں۔

حقیقی زندگی تو نام اس تعلق کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بعد اس کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔

یہ زبانی اقرار کے بعد اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔

رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا۔ — مالک ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کرلی۔ (آل عمران - ۱۹۳)

جی ہاں اس اقرار کے ساتھ ہی مومن ایک نئی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے جہاں وہ صرف اللہ تعالیٰ کے آگے سر جھکاتا ہے اور اس روئے زمین پر اپنے آقا کی مرضی کے مطابق نقل وحرکت کرتا ہے۔

اپنے تصرّفات، محبت ونفرت، امن وجنگ، حلال وحرام، ثواب وعذاب، اپنے پروردگار سے قربت کی تلاش اور وہاں سے نامراد لوٹائے جانے کے خوف وغیرہ میں وہ محکوم وتابع دار ہوتا ہے۔

یہ ایمان ایک بالکل ہی نئی زندگی پیدا کرتا ہے۔

افریقہ کے صحراؤں میں پھرتے ہوئے حبشی کو جدید ترین ماحول کے ایٹمی سائنس داں کے مقابلے میں بہت پسماندہ سمجھا جائے گا۔

کائنات اور زندگی کے بارے میں ایک کا نظریہ دوسرے سے بالکل مختلف ہوگا اور دونوں کے درمیان زبردست فاصلہ ہوگا۔

لیکن ایسا ہی فاصلہ اللہ تعالیٰ کو پہچاننے والے شخص اور اس سے بے خبر شخص کے درمیان بھی ہوتا ہے۔

اپنے پروردگار سے غافل انسان ــــ چاہے مادّی طور پر کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو ــــ برباد ہونے والے جانور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ بعض معاملات میں ذہین ہو لیکن خدا کو نہ پہچاننا اسے پسماندگی ہی نہیں انتہائی پستی میں پہنچا دیتا ہے۔

بلاشبہ وہ ایک مُردہ ہے چاہے فضا کی پہنائیوں ہی میں کیوں نہ چکر لگاتا پھرے اللہ تعالیٰ کو نہ پہچاننا ایک خوفناک سیاہ دھبّہ ہے۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔

(الانعام - ۱۲۲)

کیا وہ شخص جو پہلے مُردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اُجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو؟ کافروں کے لیے تو اسی طرح ان کے اعمال خوشنما بنا دیے گئے ہیں۔

مومن و منکر کے درمیان فرق اس آیت سے واضح ہو جاتا ہے۔

ایمان والی زندگی سے نکلنے والی یہ روشنی کیا ہے؟

یہ ضمیر کی روشنی ہوتی ہے جس سے انسان بھلائی برائی میں تمیز کرتا ہے اور نیکی و بدی کو پہچانتا ہے۔

اور اسی امتیاز کی بدولت ایمان قابلِ ترجیح و احترام ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے کٹے ہوئے لوگ صرف دنیاوی زندگی کی طرف متوجّہ رہتے ہیں اور موقع پاتے ہی کسی جرم کے ارتکاب سے باز نہیں آتے۔

جبکہ اللہ تعالیٰ سے تعلق والے لوگ عدل و انصاف، تقویٰ و پاکیزگی وغیرہ کے کمال کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

رُوئے زمین پر برکت اور معاشرے میں اطمینان و سکون اسی ایمان کے سائے میں پھیل سکتا ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۔ (فاطر۔ ۱۹-۲۲)	اندھوں اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے۔ نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں نہ ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی ہے اور نہ زندے اور مُردے مساوی ہیں۔

جی ہاں! ایمان زندگی ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دلوں میں ایمان کے اثر کی تشبیہ زمین میں پانی کے اثر سے دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علم و ہدایت دے کر مبعوث فرمایا ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے زمین پر زیادہ مقدار میں بارش ہو تو جو زمین سازگار ہوگی وہ پانی کو جذب کر کے کافی سبزہ وغیرہ اُگائے گی"

وحی کو رُوح کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ مردہ دلوں کو زندہ کرتی ہے اور اندھی نگاہوں کو روشنی بخشتی ہے۔

صحیح ایمان اور جعلی ایمان کے درمیان فرق یہ ہے کہ صحیح ایمان سے گویا آدمی از سر نو پیدا ہوتا ہے اور ایک صحیح زندگی گزارتا ہے جبکہ جعلی ایمان سے کوئی اثر نہیں ہوتا۔

صحیح ایمان بھلائی کرنے اور حق کی مدد کرنے کے لیے زبردست قوت بن جاتا ہے جیسے کسی انجن میں ایندھن ڈال دیا جائے جبکہ جعلی ایمان سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

صحیح ایمان انسانی وجود کو اس طرح ڈھالتا ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے تابع بن جاتا ہے اور اسی کے نام پر ہر قدم اٹھاتا ہے جبکہ جعلی ایمان انسان کو محض اپنی خواہش کا غلام بناتا ہے۔

اگر حکومتیں کھوٹے سکوں اور نوٹوں کی روک تھام کے لیے جعل سازوں کے خلاف سخت قدم اُٹھاتی ہیں تو پھر کیا یہ اس سے زیادہ مناسب بات نہیں ہوگی کہ جعلی ایمان کو مٹانے کی کوشش کی جائے تاکہ صحیح ایمان کی قیمت اور اس کے معنوی و مادی اثرات

اور فوائد برقرار رہیں۔

اگر ہم سمجھنے کی کوشش کریں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ایمان کی صحت کی حفاظت سونے چاندی اور نوٹوں کی صحت کی حفاظت سے زیادہ اہم ہے۔

ایمان جو زندگی پیدا کرتا ہے اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے فضا پر کتنی ہی تاریکی کیوں نہ مسلط ہو بلکہ اہلِ ایمان کو صبر وثابت قدمی سے کام لینا چاہیے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا (الحجرات۔ ۱۵)

حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے پھر انھوں نے کوئی شک نہ کیا۔

اور ایمان کسی ایک مسلک میں محدود نہیں حق کا جو بھی تقاضا ہو اس کو ماننا ضروری ہے چاہے حالات کتنے ہی بدل جائیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ۔ (الانفال۔ ۷۴)

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں ان کے لیے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔

ایمان جو زندگی پیدا کرتا ہے اس میں یہ محال ہے کہ غلطی و کجی بغیر گرفت کے رہ جائے چاہے اس کے نتیجے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ درپیش ہوں۔ کیونکہ اہلِ ایمان کو حق کی بات کہنے اور صبر وثبات سے کام لینے کی ہدایت کی گئی ہے۔

کبھی لوگ سرکش حکمراں کی گرفت سے گھبرا جاتے ہیں۔ کبھی زندگی کی راحتوں میں کھو کر نرم پڑ جاتے ہیں۔ جبکہ صحیح ایمان صرف خدا کی خوشنودی کی طلب اور اسی کے غضب سے خوف پیدا کرتا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ

سچے اہلِ ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی

عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (الانفال - ۲)

آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔

کچھ لوگ اپنی خاص پوزیشن کے تحفظ کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں لگائے رہتے ہیں۔

آج کے دور میں عوام کی طرف سے فرد کی پوجا اور فرد کی طرف سے عوام کی پوجا بھی عام ہو چکی ہے۔ اگر انسان اپنے ہر عمل، ترکِ عمل اور خرچ وغیرہ میں صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو پیش نظر رکھے تو ایسا نہیں ہو سکتا۔

کیونکہ یہ ریاکاری ہے جس سے عمل ساقط ہو جاتا ہے اور دل برباد ہو جاتا ہے۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں:

"اگر کسی بندے کو حضرت آدمؑ کی قناعت، حضرت عیسیٰؑ کا زہد، حضرت ایوبؑ کا صبر، حضرت یحییٰؑ کی اطاعت، حضرت ادریسؑ کی استقامت، حضرت ابراہیمؑ کی محبت اور حضرت محمدؐ کا اخلاق مل جائے اور اس کے دل میں غیر اللہ کی ذرا بھی گنجائش ہے تو اللہ اس سے بے نیاز ہوگا۔"

یہ حقیقت بھی ہے کہ دل میں ریا کا پیدا ہونا ایمان کے لیے تباہ کن اور ثواب کے لیے مہلک ہے۔

بارش نازل ہوتی ہے تو زرخیز زمین کی صلاحیتِ نمو دجاگ جاتی ہے اور وہی بارش پتھر پر پڑے تو اس کے بنجر پن اور سختی ہی کو نمایاں کرتی ہے۔

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ۔

اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک چٹان تھی، جس پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں، اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا اور

کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں۔ (البقرہ - ۲۶۴)

ایمان جو زندگی استوار کرتا ہے اس کی امتیازی خصوصیت پروردگارِ عالم کے لیے گہرا اخلاص اور مکمّل یکسوئی ہے۔

ایمان انسانی رجحانات و جذبات کا رُخ پھیر دینے کے فیصلہ کُن عمل کا نام ہے۔

جو انسان کسی دینی چھاپ سے محروم ہے وہ بھی رنج و راحت، بردباری و غضب، تکبر و تواضع، نرمی و سختی اور یاس و اُمید جیسے انسانی جذبات و حالات سے دوچار ہوتا ہے لیکن جعلی ایمان اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

قدیم زمانے سے تربیتی ماہرین اللہ تعالیٰ سے انسان کے خوف، اس سے اُمید، اس کی طرف رجوع اور اس پر انحصار وغیرہ کی ضرورت پر زور دیتے رہے ہیں۔

یہ درست ہے لیکن حقیقت کا یہ صرف ایک پہلو اور تصویر کا ایک رُخ ہے اور عوام نے پوری بات نہیں سمجھی۔

سب مانتے ہیں کہ ایمان صبر و شکر اور امید و بیم کا نام ہے۔

لیکن کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ اس طرح کے احساسات ایمان دل میں پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن دل اپنی عام فطرت پر باقی رہتا ہے۔ کبھی اللہ سے ڈرتا ہے کبھی غیر سے۔ کبھی اللہ سے اُمید لگاتا ہے کبھی غیر سے۔

یہ نہ تو مقصود ہے نہ مخلصانہ و مکمّل ایمان ہے۔

مومن اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملے میں، اس کی توحید اور اس کے اسماء و صفات کے ادراک میں، اپنے طرزِ زندگی کی بنیاد اپنے پروردگار کے لیے مکمل سپردگی، صرف اسی سے تعلق اور اس کے ماسوا کو نظر انداز کرنے پر رکھتا ہے۔

یہ توحید نہیں ہے کہ ہم پتھر کے بتوں کو تو نہ مانیں اور مال و دولت کو، جاہ و عزت کو، عورت کو یا حکمراں کو بت بنالیں اور اپنے تمام یا کچھ احساسات و جذبات کا رُخ ان نئے بتوں کی طرف پھیر دیں۔ ظاہر و باطن کی بیشتر سرگرمیاں اُن کے لیے ہوں اور تھوڑی سی اللہ تعالیٰ کے نام پر۔

یہ بات عام نظر آتی ہے کہ بہت سے لوگ اپنے خالق کے لیے گرم جوشانہ جذبات نہیں رکھتے جبکہ دوسروں کے لیے گرم جوش ہیں۔

آخر یہ کون سا ایمان ہے؟

یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ بزعم خود اللہ تعالیٰ سے امید قائم کرتے ہیں لیکن ان کے طرزِ عمل میں اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ ناؤ خشکی پر نہیں چلا کرتی۔

بہت سی دینی تہذیبیں اس لیے زوال کا شکار ہوئیں کہ حقیقت سے ان کا تعلق باقی نہیں رہ گیا تھا۔ جب انسانی نفس کی باگ ڈور بیدار ایمان کے بجائے خواہشاتِ نفس کے ہاتھوں میں آجائے تو محض نام سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟

جب انسانی احساسات کا تعلق ایمان سے کمزور پڑ جائے تو گناہ ہی کا رشتہ باقی رہ جاتا ہے کیونکہ اگر انسان کے قلب کی گہرائیوں میں ایمان جاگزیں نہیں تو وہ ایک بیمار ایمان ہے اور اس کے علاج کی ضرورت ہے۔

مثلاً اللہ پر توکل، مومن کے دل میں اقتدار پر انحصار سے کہیں زیادہ مضبوط ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح دنیا کے عاجلانہ فائدوں کے مقابلے میں آخرت کی ترجیح مومن کے دل میں کہیں زیادہ طاقتور ہونی چاہیے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (البقرہ ۔ ۱۶۵)

کچھ لوگ ایسے ہیں۔ جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدِ مقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔

ایمان زندگی کو طاقت و نمو بخشتا ہے اور اسے بقا و احترام کے لائق بناتا ہے۔

آج کے دور میں بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ دین نام ہے انسان اور اس کے پروردگار کے درمیان شخصی تعلق کا یعنی یہ انسان اور حواس سے بالاتر غیبی قوتوں کے درمیان تعلق کا نام ہے اور اس کی نمائندگی زیادہ تر فرد کی عبادتی رسموں سے ہوتی ہے۔

اس طرح کا گمان اسلام کے تعلق سے بالکل صحیح نہیں۔

اسلام کا دائرہ وسیع ہے اور اس کی تعلیمات محدود نہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان تعلق، انسان اور انسان کے درمیان تعلق اور انسان اور زندگی کے درمیان تعلق سب کا احاطہ کرتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام انسان اور اس کے پروردگار کے درمیان تعلق کی جو تشریح کرتا ہے اس میں انسان کی داخلی زندگی سے لے کر انسان کے دیگر اشیاء کے ساتھ تعلقات بھی شامل ہیں وہ ان سب چیزوں کے ساتھ معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق، اس سے وفاداری، اس کی ہدایات کی پیروی اور اس کی مکمل فرماں برداری کی روشنی میں کرتا ہے۔

وحیِ الٰہی جس پر یہ دین قائم ہے مہد سے لحد تک انسان کے مختلف معاملات سے بحث کرتی ہے اور ان کے سلسلے میں مناسب راستہ دکھاتی ہے۔

ایمان کے دائرے کی وسعت ہی کی وضاحت کرتے ہوئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

"ایمان کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں۔ ان میں سب سے اہم شعبہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار اور سب سے معمولی شعبہ راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا ہے اور حیا ایمان کا ایک شعبہ ہے۔"

گویا یہ شعبے ارکانِ دین، اصولِ اخلاق اور آداب وغیرہ تک سب کا احاطہ کرتے ہیں۔ گویا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ ایمان نفس، معاشرہ اور ریاست سب پر اثر انداز ہوتا ہے اللہ کے حکم کا لحاظ گھر کے اندر بھی کرنا چاہیے اور سڑک پر بھی۔ انسان کے اپنے دل کے ساتھ بھی اور دیگر انسانوں کے ساتھ بھی۔

زندگی کا کوئی پہلو دین کے رنگ اور اس کے اصول و مقاصد سے الگ نہیں رہنا چاہیے۔

اسلامی تعلیمات کی درجہ بدرجہ ترتیب ہے۔

ایمان زندگی کی مشین کو ہم آہنگی کے ساتھ حرکت میں لانے والی چیز ہے۔

جسم کے کسی اہم حصہ مثلاً دماغ پر مہلک حملہ ہو یا مثلاً ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔

لیکن بعض اجزاء کو نقصان پہنچنے سے زندگی نہیں ختم ہوتی لیکن جسم ناکارہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ایمان بھی کامل و ناقص طور پر موجود و مفقود ہوتا ہے۔

صحیح ایمان کا اثر انسان کے دل کے محرکات و مقاصد پر، معاشرے کے نظام و معاملات پر اور زندگی کی عمرانی و اقتصادی سرگرمیوں پر بھی پڑنا چاہیے تاکہ سب کا رُخ دین کی خدمت کی طرف ہو جائے۔

اسلام کے ارکان ان تمام حقائق سے تعلّق رکھتے ہیں۔

مثلاً نماز اور روزہ ذاتی ایمان کے ارکان ہیں اور فرد ان کی ادائیگی کے لیے جوابدہ ہے۔

ان سے انسانی دل میں پاکیزگی، اخلاص اور بلندی پیدا ہوتی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ایمان کو معاشرہ پر بھی اثر انداز ہونا چاہیے۔

اس کے لیے مثلاً اللہ کی راہ میں جہاد اور جدّوجہد اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق فیصلے کرنا ہے جن سے معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور فرد کے ساتھ ساتھ ان کی بنیادی ذمّے داری معاشرے پر ہوتی ہے کیونکہ معاشرہ ہی ان کا انتظام کرسکتا ہے۔

اسلام جہاں دل میں یقین پیدا کر کے انسان کو عمل و کردار پر اُبھارتا ہے وہیں وہ دولت کے وسائل کے بارے میں رہنمائی کرتا ہے تاکہ دولت کو معاشرے کی صحیح خطوط پر تشکیل اور اسے مثالی بنانے کا ذریعہ بنایا جاسکے۔

ان وسائل سے دنیا کا کوئی ایسا نظام ہی بے نیازی اختیار کرسکتا ہے جو زوال و خودکشی کا خواہاں ہو۔

حق کی اپنی حرمت ہوتی ہے جو انسان کو اس کی قدر کرنے اور آخر تک اسے مضبوطی سے پکڑے رہنے پر آمادہ کرتی ہے۔

حق کے لیے جوش وجذبہ صحیح ایمان کا اثر ہے۔

حافظ بیہقیؒ اس کو ایمان کا شعبہ قرار دیتے ہوئے حضرت انسؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس شخص کے اندر تین باتیں ہوں وہ ایمان کی حلاوت پالے گا۔

یہ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ اسے باقی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوں۔

اور یہ کہ آدمی صرف اللہ ہی کے لیے محبت کرے۔

اور یہ کہ اسے آگ میں ڈال دیا جانا اس سے زیادہ پسند ہو کہ وہ پھر کفر میں واپس لوٹ جائے اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کفر سے نجات دی تھی۔"

حق پسندی یہ بھی ہے کہ بغیر لالچ یا خوف کے اصولی بنیاد پر دوستی یا مخالفت کی جائے۔

یعنی اللہ کے لیے لوگوں سے محبت یا ناپسندیدگی۔

اور حق کی سربلندی نیز باطل کے انسداد کے لیے گواہی۔

اس شعبۂ ایمان کا تعلق ادبِ نفس سے ہے اور انفرادی عبادات کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور اس کا اجتماعی اثر فیصلہ کن اور واضح ہوتا ہے۔

حافظ بیہقیؒ نے حلال روزی کمانے کو بھی ایمان کا ایک شعبہ قرار دیا ہے۔ کیوں کہ حدیث میں آیا ہے:

"لوگو اللہ تعالیٰ پاک ہے اور صرف پاک چیز ہی قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو بھی وہی حکم دیا ہے جو اپنے رسولوں کو دیا تھا یعنی:

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ۔ (المومنون۔ ۵۱)	اے پیغمبرو! کھاؤ پاک چیزیں اور صالح عمل کرو تم جو کچھ بھی کرتے ہو، میں اس کو خوب جانتا ہوں۔
يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا۔ (البقرہ ۱۶۸)	لوگو! زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں کھاؤ۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم حقیقت میں

طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ۔ اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انھیں بے تکلف کھاؤ۔ (البقرہ - ۱۷۲)

پھر آپؐ نے ایسے آدمی کا ذکر فرمایا جو لمبا سفر کرتا ہے اور پریشانی و پراگندہ حالی کے عالم میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر یارب! یارب کہتا ہے (یعنی دُعا کرتا ہے) جبکہ اس کا کھانا، لباس اور مشروب حرام ہوتا ہے اور حرام ہی سے اس کی پرورش ہوئی ہوئی ہے تو کہاں سے اس کی دُعا قبول ہو۔"

یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو ساری توانائیاں دُنیا لُوٹنے پر لگائے ہوئے ہیں لیکن ان کی بُرائیوں اور حرام خوری کی وجہ سے انھیں اللہ کی رحمت کا کوئی حصہ نہیں ملتا۔

روزی کمانے میں بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نتیجہ ذریعہ کو بھی درست کر دیتا ہے اس لیے حلال، حرام کی پرواہ کیے بغیر ہر طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

جس طرح چھوٹے لوگ روزی کمانے کے سلسلے میں ہر طریقہ اختیار کر لیتے ہیں اسی طرح بڑے لوگ ان منصوبوں کے حصول کے لیے ہر طریقہ اختیار کرتے ہیں جن سے ان کی جاہ و منزلت اور دولت میں اضافہ ہو۔ جبکہ اہلِ ایمان ان سب سے بری الذمہ ہوتے ہیں۔

بیہقیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے ایک دن دودھ پیا تو انھیں اچھا لگا۔ پلانے والے سے دریافت کیا کہ یہ دودھ کہاں سے لائے؟ اس نے بتایا کہ وہ کسی چشمے پر گیا تھا وہاں زکوٰۃ والی اونٹنیاں بھی پانی پی رہی تھیں وہاں ان کا دودھ نکالا گیا تو میں نے بھی اپنے برتن میں لے لیا۔ یہ وہی دودھ تھا۔

حضرت عمرؓ نے منہ میں ہاتھ ڈال کر قے کر دی۔

حضرت بشرؒ بن حارث حضرت یوسفؒ بن اسباط سے روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص عبادت کرنے لگتا ہے تو ابلیس اپنے چیلوں سے کہتا ہے کہ دیکھو اس کی روزی کا ذریعہ کیا ہے؟ اگر وہ حرام ہوتا ہے تو کہتا ہے اسے چھوڑ دو اس کے لیے وقت ضائع نہ کرو۔

یعنی اسے محنت کرنے دو وہ خود اپنی محنت رائگاں کرنے کے لیے کافی ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ سے نماز با جماعت میں پہلی صف کی فضیلت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا: یہ دیکھو کہ روٹی کا جو ٹکڑا کھا رہے ہو وہ کیسے حاصل ہوا ہے پھر چاہے آخری صف میں نماز پڑھ لو۔

یعنی نفل سے پہلے فرض پر دھیان دینا ضروری ہے۔

اگر بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ پہلی صف میں نماز پڑھنے سے حرام روزی کا کفارہ ہو جائے گا تو وہ یقیناً غلطی پر ہیں۔

حضرت حذیفہ مرعشیؒ نے لوگوں کو پہلی صف کی طرف تیزی سے بڑھتے دیکھا تو فرمایا:

حلال روزی کھانے کی طرف تیزی دکھانی چاہیے۔

دنیا سے ایمان کا تعلق صرف باعزت ڈھنگ سے روزی کمانے تک سے نہیں بلکہ زمین کے خزانوں سے روزی حاصل کرنے کی جستجو بھی بہترین کمائی ہے۔

زمین پر استحکام حاصل کرنا، اس کے خزانوں کو نکالنا، مختلف پیشوں میں مہارت حاصل کرنا، کائنات و وجود کے اسرار و رموز کو سمجھنا، یہ سب ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر بنی آدمؑ زمین کی خلافت کے مستحق ہوئے۔

اور انھیں خصوصیات میں کمی زیادتی سے ان کی حیثیت میں کمی زیادتی ہوتی ہے زندگی کی باگ ڈور سنبھالنے میں حق و باطل کے اصولوں کے درمیان مسابقت کا انحصار بھی اسی فوقیت پر ہے۔

زندگی کے مختلف فنون میں بہترین مہارت اور ان کا بہترین استعمال، حق کی بالادستی کے لیے لڑائی کا حصہ ہے اور جب اس کا مقصد اللہ کی خوشنودی کا حصول ہو تو اس کا شمار ایمان کے شعبوں میں ہوگا۔

اس میدان میں پسماندگی سے اہلِ ایمان اپنے عقائد کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکتے۔

صحیح ایمان معاشرہ و ماحول کو اپنی منزل مقصود کی طرف لے جاتا ہے اور ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔

ایمان کے شعبوں میں حسنِ اخلاق بھی ہے اور اس میں غصہ کو پی جانا، نرمی اور تواضع وغیرہ شامل ہیں۔

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ (القلم۔ ۴)
اور بیشک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔

وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (آل عمران۔ ۱۳۴)
جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کردیتے ہیں ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔

صحیحین میں حضرت عبداللہؓ بن عمرو کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فحش باتوں سے دُور دُور تھے اور فرماتے تھے کہ "تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں جو اخلاق میں سب سے بہتر ہیں۔"

ایک روایت میں ہے: "مجھے تم میں سے سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو سب سے بہتر اخلاق والا ہے۔"

صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ:

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دو چیزوں میں جب بھی اختیار دیا گیا تو آپؐ نے آسان تر کو اختیار کیا جب تک اس میں گناہ نہ ہو۔ اگر گناہ کی چیز ہوتی تو آپؐ سب سے زیادہ اس سے دُور رہتے۔ آپ نے کبھی اپنے لیے انتقام نہیں لیا ہاں اگر اللہ تعالیٰ کی حرمت کی پامالی کا معاملہ ہو تو آپؐ اللہ تعالیٰ کے لیے انتقام لیتے تھے۔"

بیہقیؒ کہتے ہیں کہ حسنِ اخلاق کا مطلب ہے نرم ترین اور بہترین افعال پر نفس کو ثابت قدم رکھنا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام پر بندے کو شرحِ صدر حاصل ہو اور پوری خوش دلی کے ساتھ انھیں بجالائے۔ نیکی کے کاموں میں رغبت رکھے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے بہت سی مباح چیزوں کو بھی چھوڑ دے اور دل میں تنگی نہ محسوس کرے۔ لوگوں کے ساتھ معاملات میں روادار ہو اگر وہ بیمار پڑے اور کوئی عیادت نہ کرے، اگر سفر سے آئے اور کوئی

ملنے نہ آئے، اگر سلام کرے اور کوئی جواب نہ دے، اگر کسی کی دعوت کرے اور وہ نہ آئے کوئی سفارش کرے اور وہ نہ مانی جائے، کہیں جائے اور اسے باقاعدہ جگہ نہ ملے، کسی دوست سے ملنے جائے اور ملنے کی اجازت نہ پائے، کہیں شادی کا پیغام دے اور وہ منظور نہ ہو، قرض خواہ سے مہلت مانگے اور وہ نہ دے وغیرہ تو ایسی صورتوں میں ناراض نہ ہو اور اپنی بدحالی پر رنج نہ کرے اور یہ محسوس نہ کرے کہ وہ جفا و وحشت کا شکار ہو رہا ہے۔ اور جب اپنا موقع آئے تو وہ خود ویسا ہی سلوک نہ کرے اور جس نے بدسلوکی کی ہو اس کے ساتھ بہتر سلوک کرے اور ماضی میں اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کو فراموش کر دے۔

گویا ہر صورت میں بہترین سلوک اپنائے۔

عبادات

اسلام محبت کے جذبہ کے ساتھ معبود کے سامنے دل کو جھکانے کا نام ہے۔
یہ کسی فاتح کے سامنے مفتوح و مغلوب کے جھکنے کا نام نہیں۔
یہ ایک محبت کرنے والے کی اطاعت اور فداکاری ہوتی ہے اس ذات کے لیے جس کی تقدیس وعظمت اور ہیبت اس کے دل میں ہوتی ہے
اور انسان صرف اپنے پروردگار کے ساتھ ہی اس حالت میں ہو سکتا ہے۔ اگر کسی بھی شخص کو عوام کا معبود قرار دیا جائے تو یہ بالکل غلط ہوگا۔
عبادت میں پسند اور شوق کے ساتھ تعظیم اور رعب بھی شامل ہوتا ہے جو پروردگار عالم کے ساتھ ہی مخصوص ہے اس لیے کسی اور کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔
بعض مستشرقین نے عبادت کا مفہوم صحیح نہیں سمجھا اور یہ گمان کیا کہ عبادت کا مطلب کسی ایسی طاقت کے سامنے سر کو جھکانا ہے جو مطلق قوت یا آسمان سے نازل ہونے والی دہشت کی نمائندگی کرتی ہے۔
پھر اس غلط مفہوم کے ساتھ اسلام پر نکتہ چینی شروع کردی اور کہنے لگے کہ اسلام انسانوں اور ان کے خالق کے درمیان تعلق کی بنیاد خوف و ذلت پر قائم کرتا ہے نہ کہ محبت و مہربانی پر۔
یہ بات کتنی مضحکہ خیز ہے۔
اسلام تو صرف حقائق کی ترجمانی کرتا ہے وہ مخلوق کو خالق کے بارے میں بلاکم وکاست

بتاتا ہے۔ جس سے کچھ احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً جب لوگوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کو نعمتیں دینے والا اللہ ہے تو ظاہر ہے اس کے شکر کا جذبہ پیدا ہوگا۔

اور جب یہ بتایا جائے کہ وہی تمام معاملات کی تدبیر کرنے والا ہے تو ظاہر ہے کہ تمام معاملات میں اسی کی طرف نگاہ جائے گی۔

اور جب انسان یہ جان لے کہ بالآخر اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہوگا تو لازماً انجام کی طرف توجہ ہوگی اور ثواب و عذاب کا خیال پیدا ہوگا۔

جب اللہ تعالیٰ کو کمال و بڑائی کی ساری صفات حاصل ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی توقیر و تعریف نہ کی جائے۔

اسی طرح جب یہ بھی معلوم ہے کہ وہ گناہ پر سخت سزا دینے والا ہے تو کیسے اس کی ہیبت دل پر طاری نہ ہو؟



عبادت اللہ تعالیٰ کے تعلق سے اسی موقف کا نام ہے اور قرآن کریم کے مطالعہ سے یہی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ۔ (فاطر۔ ۳)	اے لوگو اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو کیا اللہ کے سوا کوئی بنانے والا ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے۔
يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا۔ (فاطر۔ ۵)	اے لوگو بے شک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے سو تمہیں دنیا کی زندگانی نہ بہکائے۔
يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (النساء۔ ۹)	اے لوگو اپنے رب سے ڈرتے رہو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔

ان ہدایات کو پورے شعور کے ساتھ قبول کرنے کا نام ہی عبادت ہے اور ہم پر یہ

لازم آتا ہے کہ ہم صرف اسی کی عبادت کریں، اس کے شایانِ شان اس کی حمد وثنا کریں۔ اور اس کے معاملے میں شوق یا خوف سے غافل نہ رہیں۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلْ لِّلّٰهِ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (الانعام۔ ۱۲)	پوچھو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے کس کا ہے کہہ دو اللہ کا ہے اس نے اپنے ذمے مہربانی لکھی ہے البتہ تم کو قیامت کے دن تک اکٹھا کرے گا۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ جو لوگ اپنی جان کو نقصان میں ڈال چکے ہیں وہی ایمان نہیں لاتے۔

عبادت یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو یقین کے ساتھ پہچانیں اور اس کی ہدایات کی پیروی کریں۔

جب کسی کمزور شخص کے کسی طاقتور شخص سے مدد لینے اور کسی جاہل شخص کے کسی ذی علم سے روشنی حاصل کرنے میں کوئی تعجب کی بات نہیں تو پھر اس میں حیرت کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ مخلوق اپنے خالق و رازق کی پیروی کرے؟

عبادت یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کا اعتراف کیا جائے اور مخلوق کی فطری ڈیوٹی ظاہر کی جائے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ۔ (الذاریات۔ ۵۶-۵۸)	میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں بے شک اللہ ہی رزق دینے والا اور ٹھوس قوت والا ہے۔



عبادت انسان اور اس کے پروردگار کے درمیان براہِ راست تعلق کا نام ہے جس میں کسی دوسرے کا کوئی دخل نہیں۔

اسلام نے اس تعلق کی تشریح بہت واضح طور پر کی ہے اور اس میں بیچ کے واسطوں اور سفارشیوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔

اگر آپ نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو کوئی فرشتہ یا انسان بیچ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی بڑے چھوٹے کو ساتھ لیے بغیر اپنے آقا کے دروازے پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو کوئی بھی آپ کو اللہ تعالیٰ سے رجوع کرنے اور معافی مانگنے سے نہیں روک سکتا۔

عبادت تو لوگوں اور ان کے پروردگار کے درمیان براہِ راست تعلق ہی کو کہتے ہیں۔ اور یہ تعلق جتنا مضبوط ہوگا اتنا ہی آقا کے نزدیک بندے کا مرتبہ بھی زیادہ ہوگا۔ کسی پستی میں گر جانے والے آدمی کا مرتبہ اس سے بلند نہیں ہو سکتا کہ اس کی ترجمانی کوئی ولی یا کوئی راہب و پوپ کرے۔ اسے فائدہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی پستی سے نجات حاصل کرے۔

اب اگر وہ اپنی ذاتی جدوجہد سے پاک وصاف ہوتا ہے تو کامیاب ہو گیا ورنہ کوئی اسے فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

اسی طرح جو بلندی کے مقام پر فائز ہے اسے آسمان و زمین کی کوئی دوسری چیز پست نہیں کر سکتی۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ (الانعام - ۱۶۴)

کہو کیا میں اب اللہ کے سوا کوئی رب تلاش کروں اور وہی ہر چیز کا رب ہے۔ اور جو کوئی گناہ کرتا ہے سو وہ اس کے ذمہ ہے اور ایک شخص دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَاۤءَ الْاَوْفٰى۔ (النجم-۳۹-۴۱)

اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی پھر اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی۔

بہت سے خود ساختہ دعوے داروں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان اس تعلق میں خود کو دخیل ظاہر کرنے کی کوشش کی اور یہ خیال پھیلایا کہ بندوں کو براہ راست اپنے رب سے رجوع کرنے اور اس سے توبہ واستغفار کرنے کے بجائے ان کے واسطے سے ایسا کرنا چاہیے گویا ان دعوے داروں کے واسطے کے بغیر عبادت قبول نہیں ہو سکتی۔

لیکن قرآن کریم نے فیصلہ کن انداز میں ان کی تکذیب فرمائی۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِیْلَنَا وَ لْنَحْمِلْ خَطٰیٰکُمْ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِیْنَ مِنْ خَطٰیٰهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِنَّهُمْ لَکٰذِبُوْنَ وَ لَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ۔ (العنکبوت ۔۱۲۔۱۳)

اور منکر ایمان والوں کو کہنے لگے تم ہماری راہ پر چلو اور ہم تمہارے گناہ اٹھالیں گے اور وہ ان کے گناہ کچھ نہ اٹھائیں گے۔ بے شک وہ جھوٹے ہیں۔ البتہ وہ اپنے بوجھ اٹھائیں گے اور اس کے ساتھ کتنے ہی بوجھ اٹھائیں گے۔

وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَکَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔

(آل عمران ۔ ۱۳۵)

اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو۔

وَمَنْ یَّکْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا یَکْسِبُهٗ عَلٰی نَفْسِهٖ وَکَانَ اللّٰهُ حَکِیْمًا۔

(النساء ۔ ۱۱۱)

اور جو برائی کمائے تو اس کی یہ کمائی اسی کے لیے وبال ہوگی اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْا اِلٰی رَبِّهِمْ لَیْسَ لَهُمْ

اور خبردار کردو اس قرآن سے ان لوگوں کو جن کو اس کا ڈر ہے کہ وہ اپنے رب کے

مِنْ دُوْنِہٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ۔ سامنے جمع ہوں گے اس طرح کہ اللہ کے سوا نہ

(الانعام۔ ۵۱) ان کا کوئی حامی ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ شُفَعَآءَ کیا انھوں نے اللہ کے سوا کوئی سفارش کرنے

قُلْ اَوَلَوْ کَانُوْا لَا یَمْلِکُوْنَ شَیْئًا وَّلَا والے پکڑے ہیں کہہ دو کیا وہ سفارش کریں

یَعْقِلُوْنَ قُلْ لِلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیْعًا۔ گے خواہ ان کے اختیار میں کچھ ہو نہ ہو اور وہ

(الزمر ۴۲۔۴۳) سمجھتے بھی نہ ہوں۔ کہو سفارش ساری کی ساری

اللہ کے اختیار میں ہے۔

ان آیات سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ لوگوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ سے رجوع کریں، اس کے ماسوا سے بالکل مایوس ہوجائیں اور یہ سمجھ لیں کہ ہر انسان اپنے بارے میں جوابدہ ہے اور اس کا عمل ہی اسے آگے یا پیچھے اور بلند یا پست کرتا ہے۔

اس طرح اسلامی معاشرے میں کاہنوں اور واسطوں کا طبقہ ختم ہوگیا اور ہر انسان نے یہ جان لیا کہ اس کا معاملہ کسی اور مخلوق کے ہاتھ میں نہیں بلکہ خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

عبادت کی قسمیں

عبادت دو قسم کے اعمال کہے جاتے ہیں۔

ایک قسم وہ ہے جس کی حقیقت اور ظاہری ہیئت خود شارع نے بتائی ہے جیسے نماز اور روزہ وغیرہ۔

دوسری قسم میں تمام انسانی سرگرمیاں شامل ہیں اگر ان کا مقصد نیک اور طریقہ صحیح ہو۔ اس قسم میں اخلاقی و اجتماعی نظریات بھی شامل ہو جاتے ہیں جن کا تعلق انسان کے حالات اور زندگی کے معاملات سے ہے۔

مسلمان کے طرزِ عمل کی امتیازی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے عام افعال و عادات پر مقررہ مقصد اور متعین نیت کی چھاپ ہوتی ہے۔

مثلاً تجارت ایک عام عمل ہے جو ہر طرح کے لوگ کرتے ہیں لیکن یہی عمل اس وقت عبادت بن جاتا ہے جب مسلمان اس نیت سے کرے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنی ضرورت پاکبازی کے ساتھ پوری کرے گا، اپنی اولاد کی پرورش کرے گا اور قوم کی خدمت کرے گا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حالت کو جہاد قرار دیا ہے اور قرآن کریم نے اسے شب بیداری اور کثرتِ تلاوت سے معاف رکھنے میں جہاد کے مساوی قرار دیا ہے۔

وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ عَلِمَ اللہ ہی دن اور رات کے اوقات کا حساب

اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ

(المزمل - ۲۰)

رکھتا ہے، اسے معلوم ہے کہ تم لوگ اوقات کا ٹھیک شمار نہیں کر سکتے لہٰذا اس نے تم پر مہربانی فرمائی، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو، اسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے، کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں اور کچھ اور لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، پس جتنا قرآن بآسانی پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو۔

البتہ تجارت اسی وقت عبادت ہوگی جب اسی مقصد کے ساتھ کی جائے اور ساتھ ہی فریب دہی، جعل سازی، جھوٹ، سود اور ظلم وغیرہ جیسی اخلاقی برائیوں سے اسے آلودہ نہ کیا جائے۔

یہی حالت زراعت کی بھی ہے۔ اسے دیندار بھی کرتا ہے اور بے دین بھی۔ لیکن اگر مذکورہ مقاصد اور شرائط کے ساتھ کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"جس نے کوئی درخت لگایا اور صبر کے ساتھ اس کی دیکھ بھال کرتا رہا یہاں تک کہ وہ پھل دینے لگے تو اس کا جو پھل بھی کسی کے کام آئے گا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک (درخت لگانے والے کے لیے) نیکی شمار ہوگا۔ (احمد)

اور جتنا زیادہ فائدہ ہوگا اتنا ہی زیادہ اسے ثواب بھی ملے گا۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

موت کے بعد جب بندہ اپنی قبر میں ہوتا ہے تو سات چیزوں کا اجر اسے ملتا رہتا ہے، جس نے کوئی علم سکھایا، یا نہر جاری کی، یا کنواں کھودا، یا کوئی پیڑ لگایا، یا مسجد تعمیر کی یا قرآن کریم کا نسخہ ورثہ میں چھوڑا یا ایسی اولاد چھوڑی جو موت کے بعد اس کے لیے دعائے مغفرت کرے۔" (بزار)

عام افعال کو نیک نیتی اور اچھے مقصد کی بنا پر عبادت قرار دینا اسلام کا ثابت شدہ حکم ہے اس کی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مومن کی بیشتر عبادات اسی قبیل سے ہوتی ہیں کیونکہ اس طرح کے افعال پوری زندگی کا احاطہ کرتے ہیں اور ان کے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا۔ انھیں انگلیوں پر شمار کرنے کی ضرورت نہیں۔ انسان زندگی میں جو کچھ کرتا ہے وہ سب اس میں شامل ہے۔

جو انجینئر کوئی مشین بناتا ہے وہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ وہ اپنا کام بحسن وخوبی انجام دیتی رہے۔ ہوائی جہاز کی قیمت اسی وقت تک ہے جب تک وہ پرواز کر سکتا ہے قلم اسی وقت تک اہمیت رکھتا ہے جب تک وہ لکھ سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کو پہلے اپنی ذاتی صلاحیتوں کو یقین وسلامت روی سے سنوارنا چاہیے اس کے بعد وہ زندگی میں جو کچھ کرے گا وہ خود بخود اللہ کی اطاعت بن جائے گا۔

سکّہ ڈھالنے کی مشین میں دھات ڈالی جاتی ہے تو قیمتی سکّہ بن کر نکلتا ہے اور اس کی ساخت اور مہر اسے کوئی دوسری ہی چیز بنا دیتی ہے اسی طرح مسلمان جب دنیا کے کسی معاملہ کو ہاتھ میں لیتا ہے تو اس پر اپنے ایمان کی چھاپ لگاتا ہے جس سے اس کا ہر کام قیمتی عبادت بن جاتا ہے۔ اسی صلاحیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ (البقرہ - ۱۱۱ - ۱۱۲)

ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب کہ وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔ یہ ان کی تمنائیں ہیں۔ ان سے کہو، اپنی دلیل پیش کرو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، دراصل نہ تمہاری کچھ خصوصیت ہے نہ کسی اور کی۔ حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے، اس کے لیے اس کے رب کے پاس

اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف
یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔

اور زندگی کے میدان میں نیک اعمال کی تحدید نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کے لیے خود سپردگی اور ہر کام کو مطلوبہ حسن و کمال تک پہنچانے کے لیے کیا جائے وہ نیک عمل ہے۔



اسلام نے جن عبادات کو کسی قالب میں ڈھالا ہے اور ان کے لیے وقت وغیرہ مقرر کیا ہے وہ محدود ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مخاطب کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی تشریح فرمایا کرتے تھے ایک بہت مشہور حدیث ہے کہ:

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے لا الٰہ الا اللہ و محمد رسول اللہ کی گواہی دینا، نماز قائم کرنا، زکاۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور جو استطاعت رکھتا ہو اس کا حج کرنا۔" (بخاری)

اس سے زیادہ جامع حدیث حافظ منذری کی روایت ہے:

"اسلام کے آٹھ حصے ہیں اور جسے کوئی بھی حصہ نہیں مل سکا وہ نامراد ہوا۔ ایمان ایک حصہ ہے، نماز ایک حصہ ہے، روزہ ایک حصہ ہے، زکاۃ ایک حصہ ہے حج ایک حصہ ہے، جہاد ایک حصہ ہے، بھلائی کا حکم دینا ایک حصہ ہے اور برائی سے روکنا ایک حصہ ہے۔"

سنت بھلائی اور نصیحت سے بھری ہوئی ہے ہم اس میں سے امراض کے مطابق دوائیں چن لیتے ہیں۔

قرآن کریم انسانی سلوک کے مختلف پہلوؤں کا ذکر بڑے متوازن انداز میں کرتا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ إِلَّا	ہر شخص اپنے کسب کے بدلے رہن ہے، دائیں
أَصْحَابَ الْيَمِينِ فِي جَنَّاتٍ	بازو والوں کے سوا، جو جنتوں میں ہوں گے،
يَتَسَاءَلُونَ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ۔ مَا	وہ مجرموں سے پوچھیں گے "تمہیں کیا چیز دوزخ
سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ قَالُوا لَمْ نَكُ	میں لے گئی؟" وہ کہیں گے "ہم نماز پڑھنے

مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَائِضِيْنَ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ حَتّٰى اَتَانَا الْيَقِيْنُ ۔

(المدثر۔ ۴۳۔ ۴۷)

والوں میں سے نہ تھے، اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے، اور روزِ جزا کو جھوٹ قرار دیتے تھے یہاں تک کہ ہمیں اس یقینی چیز سے سابقہ پیش آگیا۔"

جن آیات میں عبادات کا ذکر آیا ہے ان میں دو باتیں قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ اسلام نے جن عبادات کا حکم دیا ہے وہ بہت سی ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ انسان کے لیے وہ پریشان کن اور ہمت شکن ہوں بلکہ ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے بدن کی درستگی اور صحت کے تحفظ کے لیے بہت سی غذائیں دی جائیں۔

زندگی کا راستہ لمبا ہے اور اس میں بہت سی پیچیدگیاں آتی ہیں۔ مثلاً آپ کسی شہر میں ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں جائیں تو بہت سے سگنل آپ کو روکیں گے سڑک پر چلنے والی یہ سرخ و سبز بتیاں راستے میں رکاوٹ ڈالنے اور لوگوں کو پریشان کرنے کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ ان کی حفاظت اور ٹریفک کے نظام کو آسان و مضبوط بنانے کے لیے ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ بندوں کو زندگی کی راہ میں اپنی مرضی کے مطابق چلنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑتا ورنہ دنیا بگاڑ اور تکلیف دہ چیزوں سے بھر جائے۔

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰى اَبْصَارَهُمْ ۔

(محمد۔ ۲۲۔ ۲۳)

اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر تم الٹے منہ پھر گئے تو زمین میں پھر فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے۔ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور بہرا بنا دیا۔

بندوں پر شفقت کی وجہ سے ہی اللہ تعالیٰ ہدایت و رہنمائی دے کر پریشانیوں سے

بچاتا ہے اس لیے ہمیں زیادہ ہدایتوں اور کثرتِ تلقین سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ وہ تو ہمارے ہی فائدے کے لیے ہیں۔

۲۔ یہ عبادات متنوع قسم کی ہیں۔ ان کی حیثیت صرف ایک ہی روحانی غذا کی نہیں بلکہ طرح طرح کی تربیت و تعلیم کے درمیان قرآن کریم اس طرح ہم آہنگی پیدا کرتا ہے کہ وہ انسانی فطرت کی حقیقت کے مطابق ہو جائیں۔

قرآن کریم میں اخلاق کے لیے الگ باب، عقیدہ کے لیے الگ باب، معاشرہ کے لیے الگ باب اور ممنوعات وغیرہ کے لیے الگ الگ باب نہیں ہیں۔ بلکہ وہ انسان کو اس زندگی میں مختلف پہلوؤں سے تصرف کرتے دیکھتا ہے اور اس کے لیے جامع قسم کی ہدایات دیتا ہے۔

مثلاً یہ آیتیں پڑھیے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا
(الفرقان۔ ۶۳-۶۶)

رحمٰن کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں تم کو سلام۔ جو اپنے رب کے حضور سجدہ اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ جو دعائیں کرتے ہیں کہ ”اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب سے ہم کو بچالے اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے، وہ تو بڑا ہی برا مستقر اور مقام ہے۔“

ان میں لطیف انداز میں اخلاق اور اجتماعی سلوک کی تعلیم بھی ہے یعنی تواضع اور چاپلوسی سے درگزر کی۔ پھر خشوع و خضوع کے ساتھ شب بیداری کا بھی ذکر ہے۔ جو مومن کے لیے خاص نعمت ہے۔

حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس نے عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ لی اس نے گویا نصف شب نماز میں

گزاری۔ اور جس نے فجر کی نماز جماعت سے پڑھ لی اس نے گویا بقیہ نصف شب نمازیں گزاری" (مالک)

اس طرح اوّل و آخر شب کی نمازوں کے ذریعہ بندہ نیند کا استقبال پاکی کے ساتھ کرتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"ان جسموں کو پاک کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں پاک کردے گا۔ جو بندہ بھی طہارت کی حالت میں رات گزارتا ہے اس کے ساتھ ایک فرشتہ بھی ہوتا ہے جو رات میں ہر پہلو بدلنے پر دعا کرتا ہے کہ اے اللہ اپنے بندے کی بخشش فرما کیونکہ اس نے طہارت کی حالت میں رات گزاری ہے" (طبرانی)

پھر اللہ تعالیٰ سے نجات کی دعا ہے۔ ظاہر ہے مسلمان جہنم کے عذاب سے ڈرتا ہے اور اس سے ڈرنا ہی چاہیے۔

انسانی زندگی میں برے رجحانات کی روک تھام کے لیے، فوری یا کچھ دیر سے سزائیں ناگزیر ہیں۔

انفرادی اور قومی جرائم محض نصیحتوں اور تقریروں سے نہیں روکے جاسکتے بلکہ ان کی ویسی ہی سزائیں روک تھام کرسکتی ہیں۔

آخرت کے عذاب سے نجات کی دعا صرف زبان سے نہیں ہوتی بلکہ عمل و سلوک سے ہوتی ہے۔

قُلْ إِنِّيٓ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ وَأُمِرْتُ لِأَنْ أَكُوْنَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ قُلْ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ (الزمر ۱۱ - ۱۳)	ان سے کہو، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کرکے اس کی بندگی کرو، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں مسلم بنوں، کہو، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

اللہ کے بندوں کی صفات کا سلسلہ آگے چلتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔ (الفرقان۔ ۶۷)

جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔

یہ بہترین اقتصادی رہنمائی ہے کیونکہ خرچ میں اعتدال فرد کے لیے بھی اچھی چیز ہے اور معاشرے کے لیے بھی۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا۔ (الفرقان۔ ۶۸۔ ۷۱)

جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے، اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے روز اس کو مکرر عذاب دیا جائے گا اور اسی میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ الا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو، ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور رحیم ہے۔ جو شخص توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے۔

یعنی اعتقاد میں توحید اور عمل و سلوک میں نیک نیتی و اخلاص۔
انسانی خون یعنی زندگی کے حق کی حرمت۔
دونوں جنسوں کے درمیان پاکیزگی کی بنیاد پر تعلقات۔

یہ سب عبادتیں اسلامی معاشرے کے ارکان ہیں اور عام زندگی میں ان کا تحفظ ضروری ہے۔

اب اگر کسی شخص سے غلطی ہو جائے تو اس کے لیے توبہ کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ رجوع کرنے والے دل کے لیے آسمان کے دروازے بند نہیں۔ جو بھی خدا کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے گناہ سے نجات کا راستہ موجود ہے۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۔ (الفرقان۔ ۷۲)

(اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔

خاص و عام معاملوں میں جھوٹی گواہی بہت بڑی برائی ہے۔

جھوٹی گواہی اور جعل سازی سے جان و مال کا نقصان تو ہوتا ہی ہے لیکن عام معاملات میں اس کے نتائج اور بھیانک نکلتے ہیں۔

اہم مناصب کے لیے معمولی صلاحیت و کردار کے نا اہل لوگوں کو امیدوار بنانا اور انتخابات میں ایسے لوگوں کو ووٹ دینا بھی جھوٹی گواہی میں داخل ہے۔ اللہ کے بندوں کو اس طرح کی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔

اللہ کے بندے نفسیاتی طور پر نرم دل ہوتے ہیں اور نصیحت و رہنمائی کو مانتے ہیں اس طرح کے نہیں ہوتے کہ:

سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ۔ (الاعراف۔ ۱۹۳)

انھیں پکارو یا خاموش رہو دونوں صورتوں میں تمہارے لیے یکساں ہی رہے۔

اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ۔ (الاعراف۔ ۱۹۸)

بلکہ اگر تم انھیں سیدھی راہ پر آنے کے لیے کہو تو وہ تمہاری بات سن بھی نہیں سکتے بظاہر تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر فی الواقع وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔

بلکہ اصحابِ بصیرت کی طرح فوراً چونک اٹھتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا۔ (الفرقان۔ ۷۳)	جنہیں اگر ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے۔

اللہ کے بندے دنیا میں مستحکم خاندان کے خواہاں ہوتے ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں کہ انھیں ایسی بیوی ملے جس سے دل اور آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ایسی اولاد ملے جن سے ان کا دل خوش ہو جائے اور وہ آخرت میں بلند مقام حاصل کریں۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا خٰلِدِيْنَ فِيْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا۔ (الفرقان - ۷۴-۷۶)	جو دُعائیں مانگا کرتے ہیں "اے ہمارے رب، ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا" یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے صبر کا پھل منزلِ بلند کی شکل میں پائیں گے۔ آداب و تسلیمات سے ان کا استقبال ہوگا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ کیا ہی اچھا ہے وہ مستقر اور وہ مقام۔

گویا عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات سب کو باہم مربوط کیا گیا ہے تاکہ ان اوصاف کے ذریعہ لوگ رحمت کرنے والے اللہ کے بندے بن جائیں اور یہ مرتبہ ہر ایک کو نہیں ملتا بلکہ اسی کو ملتا ہے جو اس کے لیے تیاری اور کوشش کرے گا۔



قرآن کا طریقہ تربیت یہی ہے اور بار بار مختلف سورتوں میں ان کو دہرایا گیا ہے مثلاً سورۂ انعام کی آیات (۱۵۲-۱۵۱) سورۂ رعد کی آیات (۱۹-۲۵) سورۂ بنی اسرائیل کی آیات (۲۳-۳۸) سورۂ شوریٰ کی آیات (۳۶-۴۳) سورۂ مومنون کی آیات (۱-۱۱) پڑھیے۔ جن میں ایسی بہترین باتیں اور نصیحتیں ہیں جو انسانی سیرت و سلوک کے مختلف پہلوؤں کی

رہنمائی کرتی ہیں صرف کسی ایک پہلو کو لے کر باقی پہلوؤں کو نظر انداز کر دینا کج فہمی ہوگی۔



اللہ تعالیٰ نے جہاں کچھ فرائض بنائے ہیں وہیں کچھ چیزوں سے منع فرمایا ہے۔ اور ان کے ارتکاب سے ڈراتے ہوئے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان سے نیکیاں بھی برباد ہو جاتی ہیں۔ ظاہر و باطن دونوں میں ان برائیوں سے بچنا ضروری ہے اور اس پروردگار سے خوف کھاتے رہنا ضروری ہے جو دلوں کی مخفی چیزوں اور گوشۂ چشم کی حرکات تک سے بخوبی واقف ہے۔

وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ (الانعام۔ ۱۲۰)

تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی، جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ شخص وہ ہوتا ہے جو مخلوق کے سامنے تو نیکی اور خشوع و خضوع ظاہر کرتا ہے اور جب تنہا ہوتا ہے تو برائی کرنے سے نہیں جھجکتا۔

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں اپنی اُمت کے کچھ ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو قیامت کے دن پہاڑ جتنے روشن اعمال لے کر آئیں گے لیکن اللہ تعالیٰ انھیں بالکل ہوا کی طرح اڑا دے گا۔

ثوبانؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمیں ان کے بارے میں صاف صاف بتا دیجیے۔ کہیں ہم ناواقفیت کی بنا پر ان میں سے نہ ہو جائیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ تم میں سے اور تمہارے بھائی ہی ہوں گے۔ رات کو تمہاری ہی طرح شب بیداری بھی کرتے ہوں گے لیکن وہ ایسے لوگ ہوں گے کہ جب تنہائی میں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی حرمتیں پامال کریں گے۔" (ابن ماجہ)

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے جو گناہ ناپسندیدہ قرار دیے ہیں ان کے بھی مختلف درجے ہوتے ہیں۔

کسی کی نوعیت معمولی ہوتی ہے۔
اور کوئی اتنا سنگین ہوتا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہی منقطع ہو جاتا ہے۔ ایمان کی بنیاد تہس نہس ہو جاتی ہے اور بندہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔
اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہم روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ کچھ غلطیاں ایسی ہو جاتی ہیں جن میں کچھ وقت یا کچھ مال ہی ضائع ہوتا ہے اور بعض جرائم ایسے سرزد ہو جاتے ہیں جن سے زندگی ہی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔
پھر معمولی گناہوں کی جرأت بسا اوقات نفس کو بالکل سرکشی ہی تک پہنچا دیتی ہے۔
اسلام گناہوں سے ڈراتا ہے ضمیر میں محاسبہ کی صلاحیت پیدا کرتا ہے اور مسلمان کو ہر ایسا کام کرنے سے احتیاط کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والا ہو۔
انسانی نفس چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے اکثر محفوظ نہیں ہوتا۔ بڑے گناہوں اور جرائم کی روک تھام اور امت کو ان کی ہلاکتوں سے بچانے کے لیے اسلام بھرپور زور دیتا ہے۔

اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا کَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُکَفِّرۡ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَنُدۡخِلۡکُمۡ مُّدۡخَلًا کَرِیۡمًا۔ (النساء - ۳۱)	اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم تمہارے حساب سے ساقط کر دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کر دیں گے۔

نماز

وقتاً فوقتاً دیہاتوں کے سناٹوں اور شہروں کے شور و غوغا کو چیرتی ہوئی ایک دلآویز، منظم اور بامعنی زوردار آواز کانوں تک پہنچتی ہے۔

یہ ناقوس کی بے معنی آواز یا بانسری کی جذبات خیز نغمہ سرائی نہیں ہوتی بلکہ دل و دماغ کو ایک ساتھ اپیل کرنے والی آواز ہوتی ہے۔

وہ ذہن و احساس میں زندگی کی پاکیزہ ترین حقیقت کو پھر سے ذہن نشین کراتی ہے اور دنیا کی آلائشوں میں پھنسے ہوئے دل و دماغ کی غفلت کا پردہ چاک کر دیتی ہے۔ یہ مؤذن کی آواز ہوتی ہے:

اللہ سب سے بڑا ہے

اللہ سب سے بڑا ہے

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اسلام کا پیغام انسان کو بلندی تک پہنچانا اور معنوی و مادّی ترقّی کے ایک شریفانہ معیار پر برقرار رکھنا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نماز مشروع کی ہے۔

اور اس سے پہلے طہارت واجب قرار دی ہے کیونکہ انسانی جسم کو بار بار نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ گندگی اور بدبو اس پر مسلّط نہ ہو جائیں اسی لیے بار بار اسے دھونا اور صاف کرنا ضروری ہوتا ہے۔

پورے بدن کو پاک کرنا سب سے پہلے ضروری ہے پھر بار بار جسم کے مختلف اعضاء کو دھونا پڑتا ہے۔

اسلام نے انسانی سربلندی کے لیے جہاں ایمان کو بنیادی قرار دیا ہے وہیں جسمانی صفائی کو اس ایمان کا نصف قرار دیا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

"وضو ایمان کا ایک حصّہ ہے" (ابوداؤد)

"دین کی بنیاد صفائی ستھرائی پر رکھی گئی ہے"۔ (تیسیر الوصول)

انسانیت نے شروع سے آج تک اسلام سے زیادہ انسان کی صفائی ستھرائی اور پاکیزگی کے تعلق سے حساس کوئی اور دین دیکھا اور نہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اس پر زور دینے والی کوئی اور شخصیت۔

بے شمار احادیث میں ان کی تاکید آئی ہے حتیٰ کہ منہ اور ناک وغیرہ کے صاف کرنے پر گناہوں کی بخشش کی خوشخبری دی گئی ہے اور اس صفائی ستھرائی کے بعد جب مسلمان نماز پڑھتا ہے تو وہ معصوم بچّے کی طرح پاک صاف ہو جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ بن عبسہ سلمی بیان کرتے ہیں کہ دورِ جاہلیت میں بھی میں خیال کرتا تھا کہ بتوں کی پوجا کر کے لوگ گمراہی میں مبتلا ہیں۔ پھر میں نے مکہ مکرّمہ کے ایک شخص کے بارے میں سُنا کہ کچھ باتیں بتلاتے ہیں۔ میں اپنی سواری پر بیٹھا اور وہاں پہنچا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور باتوں کے علاوہ میں نے دریافت کیا۔

"یا رسول اللہ! مجھے وضو کے بارے میں بتائیے۔

آپؐ نے فرمایا: تم میں سے جو آدمی وضو کرنے بیٹھتا ہے اور کلّی کرتا ہے اور ناک صاف کرتا ہے تو اس کے چہرے کے گناہ منہ اور ناک سے نکل جاتے ہیں پھر جب وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے کے گناہ داڑھی کے کنارے سے جھڑتے ہیں۔ پھر جب وہ کہنیوں تک ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے ہاتھ کے گناہ انگلیوں سے پانی کے ساتھ جھڑ جاتے ہیں۔

پھر سر کا مسح کرتا ہے تو سر کے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔

پھر وہ ٹخنوں تک پیر دھوتا ہے تو انگلیوں سے پیر کے گناہ پانی کے ساتھ جھڑ جاتے ہیں پھر جب وہ نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان اس کی حمد و ثنا کرتا ہے۔ اور اپنا دل پوری طرح اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ رکھتا ہے تو اس طرح معصوم واپس لوٹتا ہے جیسے اپنی پیدائش کے دن معصوم تھا۔ (مسلم)



اسلام میں نماز اپنے پروردگار کے لیے بندے کے احساس کے تعبیر کا نام ہے۔

حالتِ قیام میں نمازی قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے۔

رکوع و سجود میں عملی و زبانی طور پر اللہ تعالیٰ کی پاکی و بزرگی بیان کرتا ہے۔

حالت قعدہ میں اپنے رب کو سلام پیش کرتا ہے۔

پھر نماز ختم کرتے ہوئے دائیں بائیں سلام کرتا ہے۔

اگرچہ نماز صبح، دوپہر، عصر، مغرب اور عشاء کے اوقات میں فرض ہے لیکن فرض رکعتوں کی تعداد سترہ سے زیادہ نہیں اور کل ملا کر آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگتا۔

کیا دن اور رات کے مختلف حصّوں میں روحانی و ذہنی بیداری کے لیے یہ وقت زیادہ ہے؟

انسان باقی ساڑھے تیئس گھنٹوں میں کیا کرتا ہے کبھی اس پر بھی غور کرتا ہے؟ کچھ لوگوں کے مزاج میں ناقابلِ علاج ناشکرا پن ہوتا ہے انھیں نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونا تو اچھا لگتا ہے لیکن شکریہ ادا کرنا بھاری محسوس ہوتا ہے۔

جو لوگ ان نمازوں میں کوتاہی کرتے ہیں وہ درحقیقت نہ خالق کے یہاں قدردانی کے مستحق ہیں نہ مخلوق کے احترام کے۔ جو اپنی ڈیوٹی ہی نہ ادا کرے ظاہر ہے وہ کسی عزت کا حقدار نہیں ہو سکتا۔

اس طرح کے لوگوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔

ایک قسم تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جو کاہلی اور غفلت کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے

بارے میں حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کی ہیں جس نے انھیں ادا کیا اور ان کے حق کو معمولی سمجھ کر ضائع نہیں کیا تو اس کے لیے اللہ کے یہاں وعدہ ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کر دے گا اور جس نے انھیں ادا نہیں کیا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی وعدہ نہیں اگر وہ چاہے گا تو سزا دے گا اور اگر چاہے گا تو جنت میں داخل کر دے گا۔ (مالک)

دوسری قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کے دل ایمان اور حق کی معرفت سے خالی ہوتے ہیں ان کے بارے میں حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کی اس روایت میں اشارہ ملتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دن نماز کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"جس نے ان نمازوں کی پابندی کی وہ قیامت کے دن ان کے لیے نور، دلیل اور نجات کا ذریعہ بن جائیں گی اور جس نے ان کی پابندی نہیں کی ان کے لیے نہ نور بنیں گی اور نہ دلیل و نجات، ایسا شخص قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور اُبَی بن خلف کے ساتھ ہوگا" (احمد)

روزہ

اس عبادت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس پر قابو پائے، اپنی خواہش کو اپنے تابع کرے اور اس کی یہ صلاحیت طاقتور ہو جائے کہ وہ جس چیز کو چاہے چھوڑ سکے اور ناپسندیدہ چیز کو برداشت کرے۔

یعنی روزہ نام ہے انسانی ارادہ کو آزاد کرنے اور اسے خواہشات نفس کے بجائے اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع بنانے کا۔

اور ارادہ کی آزادی ہی انسان اور جانور کے درمیان زبردست فرق پیدا کرتی ہے جانور جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس چیز سے پریشانی محسوس کرتا ہے اسے چھوڑ دیتا ہے اس کے عزم اور شہوت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا بلکہ سرے سے اس کے پاس عزم ہی نہیں ہوتا نہ اس کی خواہشات اور فرائض کے درمیان کوئی کشمکش ہوتی ہے۔

لیکن انسان کے لیے بہت سی رکاوٹیں ہیں جو اسے بہت سی چیزوں سے روکتی ہیں۔ اگر اس کی عقل غالب ہے تو وہ اپنی خواہشات کو اپنی مرضی کے مطابق قابو میں رکھ سکتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ جانوروں سے زیادہ قریب ہے۔

خواہشاتِ نفس سے رکنا انسان اور جانوروں کے درمیان ہی فرق نہیں پیدا کرتا بلکہ کامیاب و ناکام انسانوں کے درمیان بھی خطِ امتیاز کھینچتا ہے۔

کسی بھی چیز میں کامیابی کا ذریعہ یہی ہے کہ نفس کو دشواریاں برداشت کرنے، سختیوں کو جھیلنے اور خواہشات پر قابو رکھنے کی صلاحیت ہو۔

قدیم زمانہ سے جو لوگ بلندیوں کے طلب گار رہے ہیں وہ اس حقیقت سے واقف رہے ہیں اور یہ جانتے رہے ہیں کہ بڑی راحت دشواریوں اور مشکلات کو پار کر کے ہی حاصل ہوتی ہے جو شخص بھی کوئی بڑی چیز حاصل کرنا چاہتا ہے اسے بڑی مشکلات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ بڑائی حاصل کرنے کا واحد راستہ یہی ہے۔

اسلام نے روزہ اسی لیے مشروع کیا ہے کہ لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کے بجائے ان پر قابو پانا سیکھیں۔

اسی لیے اہلِ ایمان پر روزے میں یہ فرض کر دیا گیا ہے کہ وہ طلوع فجر سے لے کر غروبِ آفتاب تک اپنے زبردست طبعی تقاضوں کو پورا نہ کریں بلکہ وقتی محرومی کی مشق کریں اور عملی تربیت کے ذریعے اس حدیث کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں کہ:

"جنت ناپسندیدہ چیزوں سے اور جہنم خواہشاتِ نفس سے ڈھانک دی گئی ہے"

(تیسیر الاصول)

روزہ کچھ چیزوں سے رکنے کا ایک منفی عمل ہے جسے لوگ اپنی نگاہوں سے دیکھ نہیں سکتے۔ یہ اخلاص کی طرح ایک پوشیدہ راز ہے جسے عالم الغیب ہی جانتا ہے یہی اس حدیثِ قدسی کا مطلب ہے کہ:

"روزہ میرے لیے ہے" (بخاری)

یہ نفس کے مادی تقاضوں سے بھی رکنا ہے اور غصہ وغیرہ جیسی اخلاقی حالتوں سے بھی۔ روزہ دار پُرسکون اور پروقار رہتا ہے جس سے اسے تزکیہ نفس اور ذکرِ الٰہی میں زیادہ مدد ملتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابنِ آدم کا ہر عمل اس کے اپنے لیے ہے سوائے روزے کے۔ یہ میرے لیے ہے اور میں ہی (خاص طور پر) اس کی جزا دوں گا۔ روزہ ڈھال ہے جب تم میں سے کسی کے روزے کا دن ہو تو نہ جنسی ضرورت پوری کرے اور نہ شور و شغف کرے۔ اگر کوئی اسے گالی دے یا اس سے لڑے تو کہہ دے کہ: میں روزے سے

ہوں، میں روزے سے ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے۔ روزہ دار کے منہ کی بُو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ خوشگوار ہے۔

روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ جب وہ افطار کرتا ہے تو وہ اس افطار سے خوش ہوتا ہے اور جب وہ اپنے پروردگار کے سامنے پیش ہوگا تو اپنے روزے (کی جزا) سے خوش ہوگا۔" (بخاری)

لوگوں کو جو مشقتیں پیش آتی ہیں ان کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں:

مثلاً غیر سنجیدگی کے مقابلے میں سنجیدگی، بیکاری کے مقابلے میں کام، باطل کے مقابلے میں حق اور بیٹھے رہنے کے مقابلے میں جدّوجہد کی مشقتیں۔

نفس کو یہ سب مشقتیں جھیلنی پڑتی ہیں کیونکہ ان کے بغیر ایمان کا تصور ہی دشوار ہے۔ لیکن کچھ مشقتیں اعلیٰ کمال اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لیے ہوتی ہیں۔ اللہ نے اس طرح کی مشقّت کا اشارہ اپنے نبیؐ سے اس وقت کیا جب آپؐ کو لوگوں کی ہدایت پر مامور کرتے ہوئے، پیغام کی اہمیت اور شب بیداری پر زور دیا۔

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ (المزمل۔ ۵)

بلاشبہ رسالت کے ساتھ عظیم ذمّے داریوں کے پیش نظر یہ بھاری بات ہے لیکن عظیم منصوبوں کی ذمّے داریاں بھی اتنی ہی عظیم ہوتی ہیں۔

اس طرح کی مشقت زبردست شخصیات کے حامل لوگوں پر ہی ڈالی گئی اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جسے چاہا منتخب فرمایا۔ ایک مشقت وہ ہوتی ہے جو نفس جھیل سکتا ہے۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔ اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمّے داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ (البقرہ۔ ۲۸۶)

روزہ مسلمان کو مشقت جھیلنے کی تربیت دینے ہی کے لیے ہوتا ہے۔



روزہ جسم کو ... دینے اور اسے عمل سے روکنے کا نام نہیں۔ ورنہ کوئی یہ بھی

کہہ سکتا ہے کہ جسمانی ریاضتیں انسانی جسم کو تباہ و برباد کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔

روزہ ایک ایسی بامقصد ریاضت اور ایک ایسا پودا ہے جو پھل لاتا ہے۔

یہ لوگوں کو معنوی بلندیوں پر پہنچنے کی تربیت دیتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ وہ کیسے بھلائی کریں اور برائی چھوڑیں، کیسے اچھی چیز سے محبت کریں اور ناپسندیدہ چیز سے نفرت کریں اور کیسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی طرف دوڑیں اور اس کی ناراضگی سے بھاگیں۔

یہ جسم کے خلاف کسی مبہم معرکہ آرائی کا نام نہیں بلکہ دل کے تزکیہ، ایمان کی تقویت اور مشقت کا اجر اللہ تعالیٰ سے طلب کرنے کا نام ہے۔

تقویٰ کی طرف دل کے اسی میلان، دنیاوی خواہشات سے بے رغبتی اور فرشتوں کے ماحول کی طرف رجحان کی اسی فضا میں یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم اسی مہینے میں نازل ہوا اور اہلِ ایمان کی یہ ذمّے داری ہے کہ دن بھر روزہ رکھنے کے بعد اپنی راتیں نمازوں سے مزیّن کریں اور اپنی زبانیں کتابِ الٰہی کی تلاوت سے تر کریں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"جس نے ایمان اور ثواب کی نیت کے ساتھ رمضان کے روزے رکھّے اس کے پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔" (بخاری)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَن تَطَوَّعَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیے گئے جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو گی۔ چند مقرّر دنوں کے روزے ہیں اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرلے اور (شروع میں یہ اجازت دی گئی کہ) جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں پھر نہ

خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَاَنْ تَصُوْمُوْا
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔
شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْ اُنْزِلَ فِيْهِ
الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ
مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ
شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ
وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ
يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا
يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا
الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا
هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔

(البقرہ - ۱۸۳ - ۱۸۵)

رکھ سکیں تو وہ فدیہ دیں ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے تو یہ اسی کے لیے بہتر ہے لیکن اگر تم سمجھو تو تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو، رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسان کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے اس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے سختی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے یہ طریقہ تمہیں بتایا جا رہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔

روزہ دلوں میں ایک پاکیزہ و روشن ماحول پیدا کرتا ہے، اور دن میں حاصل ہونے والی پاکیزگی شب بیداری میں قرآنی ہدایات کے استقبال کے لیے تیار کرتی ہے جس کی بدولت مسلمان اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و مغفرت سے زیادہ قریب ہوجاتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"روزہ اور قرآن قیامت کے دن بندے کی سفارش کریں گے روزہ کہے گا۔ اے پروردگار! میں نے اسے کھانے اور شہوت سے روک دیا تھا اس لیے اس کے بارے میں میری سفارش قبول فرمائے۔ اور قرآن کہے گا میں نے اسے رات کی نیند سے محروم کیا تھا اس لیے اس کے بارے میں میری سفارش قبول کرلے۔ آپؐ نے فرمایا، تو دونوں کی سفارش قبول کرلی جائے گی۔" (احمد)

حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ ہی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"افطار کے وقت روزہ دار کی دُعا رد نہیں کی جاتی۔"

اور خود حضرت عبداللہؓ افطار کے وقت یہ دُعا کرتے تھے کہ "اے اللہ! میں تیری اس رحمت کے واسطے سے جو ہر چیز سے زیادہ وسیع ہے تجھ سے اپنی بخشش مانگتا ہوں۔"

ایک دوسری روایت میں ہے:

"تین آدمیوں کا حق ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دُعا رد نہ کرے: روزہ دار جب تک افطار نہ کرے، مظلوم جب تک اس کی مدد نہ ہو جائے اور مسافر جب تک لوٹ کر واپس گھر نہ پہنچ جائے۔" (بزار)

اس سے ان دونوں آیتوں کی تشریح بھی ہو جاتی ہے جو روزہ والی آیتوں سے پہلے ہیں۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ۔

(البقرہ - ۱۸۶)

اور میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انھیں بتادو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں لہٰذا انھیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں شاید کہ وہ راہِ راست پالیں۔

زکوٰۃ

زکوٰۃ مال میں اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے پہلا اور سب سے اہم حق ہے۔
زکاۃ نکالنے کی بنیاد اللہ تعالیٰ سے قربت حاصل کرنے، اس کے حکم کے نفاذ اور ثواب کی طلب پر ہے۔
زکاۃ کوئی زبردستی کا ٹیکس نہیں جو جبراً زکوٰۃ نکالے یا نمود و نمائش کرے یا احسان جتائے، اس کا عمل بے قیمت ہے اور اسے عبادت نہیں سمجھا جائے گا۔
یہ تو ثواب کا ایسا کام ہے جس کا انحصار نیک نیّت پر ہے اور اس کا اول و آخر مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے یہ نماز، تقویٰ اور استغفار جیسی چیز ہے، اور ایمان کا اہم رکن ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ۔

اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے سو اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو ڈر رکھتے ہیں اور جو ہماری باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔

(الاعراف۔ ۱۵۶)

وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ۔ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ

اور اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے۔ وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے ہیں سو ہمارے گناہ بخش دے اور ہم کو دوزخ کے

وَالْقَانِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ (آل عمران - ۱۵ - ۱۷)

عذاب سے بچا۔ وہ صبر کرنے والے اور سچے اور حکم بجالانیوالے اور خرچ کرنیوالے اور رات کے پچھلے پہر گناہ بخشوانے والے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔ (الانفال۔۳-۴)

وہ لوگ جو نماز کو قائم رکھتے ہیں اور ہم نے ان کو جو روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں وہی سچے ایمان والے ہیں۔

زکاۃ کا ذکر اخلاق میں سچائی کے ساتھ اور عبادات میں نماز کے ساتھ آتا ہے اور اس کی ادائگی کے ساتھ ساتھ سحر کے وقت اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلبی کا بھی ذکر ہے۔

یہ اقتصادی منصوبہ ـــــ چاہے زکوٰۃ کی ادائگی کی وجہ سے جتنی بھی وسعت و برکت ہو ـــــ سب سے پہلے نفسیاتی اطاعت ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ تمیم کا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں کافی دولت و جائداد اور اہل وعیال رکھتا ہوں مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیسے خرچ کرنا چاہیے؟

آپ نے فرمایا: اپنے مال سے زکاۃ نکالو وہ تمہیں پاک کرے گی۔

اپنے رشتے داروں کے ساتھ سلوک کرو اور مسکین و پڑوسی اور سائل کا حق پہچانو۔ (احمد)

حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو ایمان کے ساتھ پانچ چیزیں لے کر آیا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا:

جس نے پانچوں نمازوں کی پابندی، وضوء، رکوع وسجود اور ان کے اوقات کے ساتھ کی، رمضان کے روزے رکھے، استطاعت ہوئی تو حج کیا، خوشدلی سے زکاۃ دی اور امانت ادا کی۔

عرض کیا گیا: امانت کی ادائگی کیا ہے؟

آپؐ نے فرمایا: جنابت سے غسل کرنا، اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کے دین میں اس کے

سوا کوئی اور چیز امانت نہیں قرار دی۔" (طبرانی)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تین چیزوں کے بارے میں قسم کھاتا ہوں: جس کا اسلام میں کوئی حصہ ہے اللہ تعالیٰ اسے اس شخص کی طرح نہیں بنائے گا جس کا کوئی حصہ نہ ہو۔ اور اسلام کے حصے تین ہیں: نماز، روزہ اور زکوٰۃ۔ اور ایسا نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں کسی بندے کو اپنائے اور قیامت کے دن اسے کسی دوسرے کے سپرد کر دے۔" (احمد)

پھر زکوٰۃ معاشرے کی خلیجوں کو پاٹتی ہے اور اسے برباد ہونے سے بچاتی ہے۔ زکاۃ کے ذریعے فقروفاقہ کی ذلت سے لوگوں کی پردہ پوشی ہوتی ہے۔

بہرصورت مسلمان کو کشادہ حالی میں بھی خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور تنگدستی میں بھی لوگوں کی مصیبت دور کرنے کے لیے خرچ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ ۔	اور دوڑو اپنے رب کی بخشش کی طرف اور جنت کی طرف جس کا عرض آسمان اور زمین ہے پرہیزگاروں کے واسطے تیار ہوئی ہے جو خوشی میں اور تکلیف میں خرچ کیے جاتے ہیں۔

(آل عمران - ۱۳۳ - ۱۳۴)

خوشحالی میں تو خرچ کرنے کی بات واضح ہی ہے۔ تنگدستی میں اس صورت میں خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جب دوسرے لوگوں کی حالت قابلِ رحم حد تک بری ہو جائے ایسی صورت میں اپنے کھانے تک میں سے دے دینا چاہیے اور ایسا خوشدلی کے ساتھ کرنا چاہیے۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ (البقرہ - ۱۷۷)	اور اس کی محبت پر مال دے رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔

یہ آسمانی ہدایت پہلی نبوتوں کے دور سے چلی آرہی ہے:

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ۔

(المائدہ - ۱۲)

اور اللہ بنی اسرائیل سے عہد لے چکا اور ہم نے ان میں بارہ سردار مقرر کیے اور اللہ نے کہا میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم رکھو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھی طرح کا قرض دو گے۔ تو میں البتہ دور کر دوں گا تم سے تمہارے گناہ اور تم کو ان باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں پھر اس کے بعد تم میں سے جو کوئی کافر ہو تو وہ بے شک سیدھے راستے سے گمراہ ہوا۔

خرچ کی صلاحیت رکھنے والوں پر برابر خرچ کرتے رہنے کی ذمے داری دو باتوں کی وجہ سے ہے:

۱۔ اللہ کی مخلوق میں کمزور لوگوں کی نگہداشت —— چاہے اس میں جتنا بھی خرچ ہو جائے —— کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول۔

۲۔ معاشرہ کو کینہ اور غصہ و انتقام کے جذبات سے محفوظ رکھنا، جو بخل اور دوسروں کی تکلیفیں نظر انداز کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ ہمیں بتاتا ہے کہ اس خرچ کا انجام آخرت کی ضمانت کے ساتھ دنیا کی ضمانت اور برافروختہ لوگوں کی آتشِ غضب سے دولت کا تحفظ بھی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (البقرہ - ۲۷۴)

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال رات کو اور دن کو اور چھپا کر اور ظاہر میں خرچ کرتے ہیں تو ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا ثواب ہے اور ان پر نہ ڈر ہے اور نہ وہ غمگین

ہوں گے۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ۔	اور تم جو کچھ مال خرچ کرو گے وہ اپنے ہی واسطے کرو گے جب تک کہ اللہ کی رضا جوئی میں خرچ کرو گے۔
(البقرہ - ۲۷۲)	
هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِىُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ۔	سنتے ہو، لوگ تم کو بلاتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو پھر تم میں سے کوئی ایسا ہے کہ نہیں دیتا اور جو کوئی نہ دے گا وہ اپنے آپ کو نہ دے گا اور اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو۔
(محمد - ۳۸)	

اسلام نے جو زکوٰۃ فرض کی ہے وہ ہے:

بغیر خرچ کے (بارانی) کھیتی کی پیداوار کا دسواں حصّہ۔

خرچ والی (غیر بارانی) کھیتی کی پیداوار کا بیسواں حصّہ۔

نقدی اور سامانِ تجارت کا چالیسواں حصّہ۔

اور سونے، چاندی اور مویشیوں وغیرہ کا مقرّرہ حصّہ

حج

اسلام اور خانۂ کعبہ کے درمیان کیا تعلق ہے؟
اور ہر صاحبِ استطاعت پر خدا کے اس گھر کی تعظیم کے لیے زیارت کیوں فرض کی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت سی باتیں حج کو یہ اہم مقام دیتی ہیں۔
خانۂ کعبہ روئے زمین کی پہلی مسجد ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے تعمیر کی گئی۔ اس کی تعمیر توحید کے جھنڈے کی سربلندی کی علامت ہے اور اس کے معمار دو معزز نبی ہیں ایک کو بتوں کی پرستش کی مخالفت کی وجہ سے آگ میں ڈالا گیا یعنی حضرت ابراہیمؑ۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ۔

میں نے اپنا رُخ اس کی طرف کرلیا جس نے بنائے آسمان اور زمین، سب سے یکسو ہو کر اور میں شرک کرنے والا نہیں ہوں اور اس کی قوم نے اس سے جھگڑا کیا تو وہ بولا کیا تم مجھ سے اللہ کے ایک ہونے میں جھگڑا کرتے ہو جبکہ وہ مجھے راستہ دکھا چکا۔

(الانعام۔ ۷۹۔ ۸۰)

اور دوسرے حضرت اسماعیلؑ ہیں جنھوں نے اس وقت اپنی گردن قربانی کے لیے پیش کردی جب ان کے والد (حضرت ابراہیمؑ) نے ان سے کہا کہ مجھے تمہیں قربان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

يَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ اِنْشَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ۔

اے باپ جو آپ کو حکم ہوتا ہے کر ڈالیے اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھ کو سہارنے والا پائیں گے۔

(الصّافات۔ ۱۰۲)

انھیں دونوں، اللہ تعالیٰ کے مخلص وجانثار نبیوں، نے خانۂ کعبہ کی عمارت کھڑی کی تاکہ اہلِ ایمان اس میں نماز پڑھ سکیں۔

جس مسجد کی بنیاد یہ ہو اس کی اہمیت اور مرتبہ بالکل واضح ہے۔

پھر امّتِ اسلامیہ اس دعا کا جواب ہے جو اس کی تعمیر کے دوران کی گئی تھی۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمَاعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

(البقرۃ۔ ۱۲۷۔ ۱۲۹)

اور یاد کرو جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ خانۂ کعبہ کی بنیادیں اٹھاتے تھے اور دُعا کرتے تھے اے پروردگار ہم سے قبول کر، بیشک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا حکم بردار بنا اور ہماری اولاد میں بھی اپنی فرماں بردار ایک جماعت بنا اور ہمیں حج کرنے کے قاعدے بتا اور ہم کو معاف کر بیشک تو ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے اور اے پروردگار ان میں ایک رسول انھیں میں سے بھیج کہ ان پر تیری آیتیں پڑھے اور انھیں کتاب اور حکمت کی باتیں سکھائے اور انھیں پاک کرے۔ بے شک تو ہی زبردست بڑی حکمت والا ہے۔

ظاہر ہے یہ یادگار زندہ رکھنے اور احترام کرنے کے لائق ہے۔

اس مسجد کی تعمیر کے ساتھ آنے والوں کے لیے جو دُعائیں کی گئی تھیں، کون جانتا ہے کہ ہماری ہدایت انھیں کی برکت سے ہو اور اس کا شکریہ ادا کیسے ہو سکتا ہے؟

پھر نماز جو اوّلین عملی عبادت ہے اسی خانۂ خدا کے ساتھ مربوط ہے۔ مسلمان جب قیام و رکوع و سجود کی حالتوں میں ہوتا ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہی ہے اور اسی کی حمد و ثنا اور بزرگی بیان کر رہا ہے اور اگرچہ معنوی و مادّی اعتبار سے سب سمتیں برابر ہیں ان میں کسی کا احترام مقصود نہیں، تاہم اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ سارے بر اعظموں میں پھیلی ہوئی امت روئے زمین کی اس اولین مسجد ہی کو اپنا قبلہ بنائے اور اس طرح امتِ اسلامیہ کو حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مربوط کر کے یہ واضح کر دے کہ وہ سابقہ نبوتوں کی بنیادوں سے جڑی ہوئی ہے۔ اس سے الگ تھلگ نہیں۔

الگ تھلگ تو وہ لوگ ہوئے جنھوں نے شرک اور بگاڑ کا راستہ اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور گمراہی کے مستحق ہوئے۔

اسی لیے قرآن میں آتا ہے:

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔ (البقرۃ ۱۴۹)

اور تم جس جگہ سے نکلو اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف کرو اور بے شک تمہارے رب کی طرف سے یہی حق ہے اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں اور تم جہاں سے نکلو مسجد الحرام کی طرف اپنا منہ کرو اور تم جس جگہ ہو اسی کی طرف منہ کرو تاکہ لوگوں کو تم سے جھگڑنے کا موقع نہ رہے، سوائے ان کے جو ان میں بے انصاف ہیں سو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور اس واسطے کہ تم پر اپنا فضل کامل کروں اور تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ۔



انھیں تاریخی و روحانی روابط کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے امتِ اسلامیہ پر یہ فرض

کیا کہ جو بھی استطاعت رکھے وہ عمر میں ایک بار اس مسجد کی زیارت ضرور کرے اور اس کے لیے دل آویز ہدایات دیں جن کا مقصد ایمان و یقین کے احساسات کو بیدار کرنا اور پروردگارِ عالم کے لیے اخلاص کے جذبات کو فروغ دینا ہے۔ حج کرنے والا جو کلمات منہ سے ادا کرتا ہے ان سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ (بخاری)

حاضر ہوں اے میرے اللہ، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں۔

یہ گویا اس پکار کا جواب ہے جس کی گونج صدیاں گزرنے کے بعد بھی ماند نہیں پڑی وہ پکار جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ پر وحی فرمائی تھی:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَلَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ۔ (الحج - ۲۶ - ۲۷)

اور جب ہم نے ابراہیمؑ کو اس گھر کی جگہ ٹھیک کر دی کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور میرا گھر پاک رکھ طواف کرنے والوں، کھڑے رہنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے واسطے۔ اور لوگوں میں پکار دے کہ تیری طرف حج کے واسطے آئیں پیروں چل کر اور دبلے دبلے اونٹوں پر سوار ہو کر دور راہوں سے چلے آئیں۔

جی ہاں! لوگ اسی پکار پر لبیک کہتے ہوئے آتے ہیں اور پوری کائنات اس میں شریک ہو کر اپنے رب کی پاکی بیان کرتی ہے۔ گویا یہ بنجر خطہ اچانک ایک مظاہرے میں تبدیل ہو جاتا ہے جو ذکر و شکر اور حمد و ثنا کے نعرے لگا رہا ہوتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ:

"کوئی لبیک کہنے والا جب لبیک کہتا ہے تو اس کے دائیں بائیں ہر طرف سے تمام شجر و حجر وغیرہ بھی لبیک کہنے لگتے ہیں۔ (ترمذی)

حج کا پورا موسم عبادت، تجرد، اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ، اس کی حمد و ثنا اور

غیر اللہ سے بالکل بے نیازی و بے توجہی کا موسم ہوتا ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يَا اُولِي الْاَلْبَابِ۔	حج کے چند معلوم مہینے ہیں پھر جس نے ان میں حج لازم کرلیا تو حج کے زمانہ میں جائز نہیں عورت سے بے حجاب ہونا اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا اور جو کچھ نیکی تم کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے اور زادِ راہ لے لیا کرو کہ بہتر ین زادِ راہ (سوال سے) بچنا ہے اور اے عقلمند بندو! مجھ سے ڈرتے رہو۔
(البقرہ - ۱۹۷)	



حج کے مناسک کوئی پیچیدہ چیز نہیں۔ ۹ ذی الحجہ کو میدانِ عرفات میں مغرب تک جمع ہونا اور پھر خانۂ کعبہ کا طواف کرنا یہی حج کے اہم ارکان ہیں۔

ان کے علاوہ کچھ اور چیزیں ہیں۔ مثلاً مکہ مکرمہ پہنچنے پر خانۂ کعبہ کا طواف، جمرات میں کنکری مارنا، صفا و مروہ کے درمیان سعی اور قربانی۔

کچھ لوگوں نے حج کے مناسک کو جتنا دشوار گزار سمجھ رکھا ہے وہ غلط ہے حج تو ایک پُرلطف روحانی سفر کا نام ہے۔

اسلام کی عقلی بنیاد کے ساتھ اس پر تاریخی یادوں کے پس منظر میں دلی جذبات بیدار کرنے کے لیے۔

اسلام میں حج کی ابتدا ہی سے اس موقع کو اہم مسائل پر تبادلۂ خیال اور عام رہنمائی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

۹ ہجری میں حج کے دوران مشرکین کے ساتھ ان معاہدوں کو باطل قرار دیا گیا جن کی پابندی یک طرفہ طور پر صرف مسلمانوں پر واجب تھی طاقت ور مشرکین اکثر انھیں پامال کرتے رہتے تھے۔

حجۃ الوداع میں انسانوں کے ایک جمِ غفیر کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے جو خطبہ دیا تھا وہ انسانی حقوق اور قوموں کی آزادیوں کا منشور ہے، ان سے برتر اصول اور بہتر مقاصد آج تک کبھی کانوں کو سننے کو نہیں ملے۔

حج کو مسلمانوں کے سب سے بڑے اجتماع کی صورت میں برقرار رہنا ہی چاہیے تاکہ ایک مقرر وقت اور جگہ میں دنیا کے تمام گوشوں سے آئے ہوئے موحد اللہ تعالیٰ کو یاد کریں اور شیطان کو مسترد کریں۔

بڑے اور چھوٹے گناہ

جن بڑے گناہوں کے سلسلے میں اسلام نے شدّت برتی ہے وہ بہت سے ہیں۔
بڑے گناہ (کبیرہ) وہ ہیں جن کے بارے میں قرآن و حدیث میں آخرت کے شدید عذاب یا دنیا میں سخت سزا کی وعید آئی ہے مثلاً:

حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"کیا میں تمھیں سب سے بڑے گناہ نہ بتا دوں؟ (آپؐ نے تین بار ایسا فرمایا)
ہم نے عرض کیا: کیوں نہیں یا رسول اللہ!
آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کے ساتھ قطعِ تعلق اور ان کی حق تلفی کرنا اور کسی جان کو مار ڈالنا۔
(آپ ٹیک لگائے ہوئے تھے اٹھ کر سیدھے ہو بیٹھے پھر فرمایا)
ہاں: اور جھوٹی بات کہنا اور جھوٹی گواہی دینا۔
آپ اسے برابر دہراتے رہے یہاں تک کہ ہم نے دل میں سوچا کہ کاش آپؐ سکوت فرما لیتے۔" (بخاری)

حضرت عبید بن عمیر اپنے والدؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کسی نے کبیرہ گناہوں کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا:
"یہ نو ۹ ہیں: شرک، جادو کرنا، جان مار ڈالنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا جنگ کے دن پیٹھ دکھانا، پاکباز عورتوں پر تہمت لگانا، والدین سے قطع تعلق کرنا اور ان کے حقوق ادا نہ کرنا اور بیت اللہ کی حرمت کو پامال

کرنا جبکہ اسے زندہ و مردہ دونوں صورتوں میں تمہارا قبلہ بنایا گیا ہے۔" (ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا: زناکار بوڑھا، جھوٹا بادشاہ اور گھمنڈی سربراہِ خاندان۔" (مسلم)



کچھ حالات ایسے ہوتے ہیں جن میں گناہ کی شدت اور سنگینی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً بے آبروئی کرنا بڑی بُرائی ہے لیکن یہی برائی اگر پڑوسی کی عورت یا میدانِ جنگ میں جانے والے فوجی کی عورت کے ساتھ کی جائے تو کہیں زیادہ سنگین اور انجام کے اعتبار سے زیادہ تباہ کن ہو جاتی ہے۔

حضرت مقدادؓ بن اسود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے دریافت فرمایا:

"زنا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

انھوں نے عرض کیا: حرام ہے کیونکہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے قیامت تک کے لیے اسے حرام قرار دیا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: اگر آدمی دس عورتوں کے ساتھ زنا کا گناہ کر بیٹھے تو بھی یہ اس سے کم سنگین ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کی عورت کے ساتھ زنا کرے۔" (احمد)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اپنے پڑوسی کی بیوی کے ساتھ زنا کرنے والے شخص کی طرف قیامت کے دن نہ اللہ تعالیٰ دیکھے گا نہ اسے پاک کرے گا بلکہ فرمائے گا کہ جہنمیوں کے ساتھ جہنم میں داخل ہو جاؤ۔" (ابن ابی الدنیا)

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مجاہدین کی عورتوں کی حرمت (جہاد میں) شرکت نہ کرنے والے پڑوسی ہی

ہے جیسے ان کی ماؤں کی حرمت۔

ایسا شخص جو کسی مجاہد کے گھر والوں کی نگہداشت کی ذمہ داری لے اور پھر اس کی خیانت کرے تو قیامت کے دن اسے کھڑا کیا جائے گا اور (مجاہد سے) کہا جائے گا کہ اس کی نیکیوں میں سے جتنی چاہو لے لو۔

توکیا وہ تمہارے خیال میں اس کی نیکیوں میں سے کچھ بھی چھوڑ دے گا؟" (مسلم ونسائی)

اسی طرح ناواقف کے مقابلے میں جاننے والے کا جرم زیادہ سنگین مانا جائے گا کیونکہ وہ جان بوجھ کر برائی کر رہا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس دعا میں اسی طرف اشارہ ہے:

"اے میرے پروردگار میں تجھ سے پناہ چاہتا ہوں اس علم سے جو بے فائدہ ہو اس دل سے جس میں ڈر نہ ہو، اس پیٹ سے جو سیر نہ ہو اور اس آنکھ سے جو آنسو نہ بہائے۔" (ترمذی)

بامقصد معاشرہ

اُمتِ اسلامیہ کا ایک خاص رنگ اور ممتاز طرزِ عمل ہے۔
وہ لوگوں کا کوئی ایسا گروہ نہیں جسے زندگی کی ضرورتوں اور مفادات نے یکجا کر دیا ہو۔

اسلام ایک قدیم نام ہے جس کا خاص مفہوم ہے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کی زبان پر جاری ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے قبول کر لیا تھا

مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ (الحج۔ ۷۸) تمہارے باپ ابراہیم کا دین انھیں نے پہلے سے تمہارا نام مسلمان رکھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے یہ نام تجویز کیا تھا تو کوئی نئی ایجاد نہیں فرمائی تھی بلکہ ایک قدیم حقیقت کا اثبات کیا تھا۔ یہ فطرتِ الٰہی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا فرمایا تھا اور جس کی طرف ان سے پہلے انبیاء دعوت دیتے رہے تھے۔

حضرت نوحؑ اس سے پہلے کہہ چکے تھے:

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ — پھر اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں نے تم سے تو کوئی اجر چاہا نہیں میرا اجر تو اللہ پر ہے اور مجھ کو حکم ہے کہ فرماں بردار رہوں۔

(یونس۔ ۷۲)

حضرت نوحؑ کے حق پر اس اصرار اور ثابت قدمی پر حضرت ابراہیمؑ کی پسندیدگی ہی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے اپنی مطلوبہ امت کا نام مسلم رکھا تاکہ حضرت نوحؑ ماضی میں جس بات پر زور دے چکے تھے مستقبل میں بھی اسے دوام حاصل رہے۔

اس طرح یہ امت تمام انبیاء کی وارث اور ان سب کی تعلیمات کی نمائندہ ہے ازل سے ابد تک دنیا اور اس کے پروردگار کے درمیان تعلق کی نوعیت نہیں بدل سکتی نہ کبھی اپنے عظیم پروردگار کے ساتھ لوگوں کے ربط کی نوعیت بدل سکتی ہے۔

اسلام اسی شعار اور اس سے متعلق اخلاص و اطاعت کا نام ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام — بے شک اللہ کے یہاں دین تو یہی اسلام ہے۔

(آل عمران - ۱۹)

یہ عنوان قدیم بھی ہے اور جدید بھی۔

اور مسلمانوں کی ذمّے داری یہ ہے کہ :

اوّلین حقائق کو دوسروں تک پہنچائیں۔

اور ان حقائق کو تحریف اور بگاڑ سے محفوظ رکھیں۔

نبیوں نے جو کپڑا اس انسانیت کو پہنایا تھا وہ زمانے کے گزرنے کے باوجود نہیں بدلا۔

ہاں کبھی کبھی وہ گندا ہو جاتا ہے یا کمزور ہو جانے کی وجہ سے پھٹ جاتا ہے۔

ذفت اصولوں کو دائیں بائیں موڑنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔

حضرت محمدؐ سے پہلے بہت سے نبیؑ آئے جو حق کو روشن رکھنے کی جدوجہد کرتے رہے کہ حق جعل سازیوں کا شکار نہ ہو جائے۔

کچھ لوگ شرک کو ایمان، برائی کو بھلائی نہ بنانے لگیں۔

دوسرے کچھ لوگ اپنے آپ پر ظلم نہ کرنے لگیں اور خوشگوار زندگی کے حق سے محروم کر کے اپنے جسم و روح کو عذاب میں مبتلا کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنے لگیں۔

ایسی حالتوں میں کس طرح وہ کسی ایسے شخص کے ضرورت مند نہ ہوں گے جو:

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (الاعراف۔ ۱۵۷)	وہ انھیں نیک کام کا حکم کرتا ہے اور برے کام سے روکتا ہے اور ان کے لیے سب پاک چیزیں حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور اتارتا ہے ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ قیدیں جو ان پر تھیں۔

ایسا شخص جو راہ کے ان نشانوں کو اجاگر کرے جنھیں بھول اور سرکشی کی ہواؤں نے دھندلا کر دیا یا مٹا دیا ہو۔

مسلمانوں کو کبھی اس بات پر افسوس نہیں ہوا نہ ہو ہی سکتا ہے کہ یہودیوں نے حضرت موسیٰؑ کی پیروی کی یا عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی پیروی کی۔ اس طرح کا احساس بھی ان کے لیے خدا اور اس کے رسولؐ سے غداری کے برابر ہے۔

انھیں تو افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اس پیغام الٰہی سے کنارہ کشی اختیار کر لی جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ لے کر آئے تھے اور خود اپنی اصلاح اور دنیا کی اصلاح کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کنارہ کشی کے بعد یہ بات فطری تھی کہ اللہ تعالیٰ زمین کو ایسے لوگوں کی ذمہ داری میں چھوڑ کر انارکی کے حوالے نہ کر دے جنھوں نے ہدایات کو ماننے ہی سے انکار کر دیا ہو۔

اسی لیے اسلام کی ضرورت پیش آئی اور اسی لیے امت اسلامیہ کا وجود ہوا جو شب و روز کی گردش کے ساتھ باقی رہے گا۔

جو خصوصیت اس امت کا امتیاز ہے اور جس کی بنا پر وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں عزت کی مستحق ہو سکتی ہے وہ دین کی حقائق کی اشاعت، اللہ تعالیٰ کے حدود کا تحفظ، بھلائی کو بھلائی کی حیثیت سے اور برائی کو برائی کی حیثیت سے برقرار رکھنا ہے۔

اور یہ خصوصیت امت کو لوگوں کے درمیان ویسا ہی امتیاز عطا کرتی ہے جیسا امتیازی مرتبہ خود ان کے مقابلے میں ان کے رسول کو حاصل ہے۔

جس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حق کو پوری طرح واضح فرمادیا اور آخر میں یہ کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ تو گواہ رہنا کہ میں نے پیغام پہنچادیا ہے اسی طرح امت پر بھی حق کی وضاحت، اسی سے نسبت اور اسی کے لیے اور اسی پر جینے کی ذمّے داری عائد ہوتی ہے۔

امتِ اسلامیہ کا ایک مقصد اور پیغام ہے:

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ۔

اور اللہ کے واسطے ویسی ہی محنت کرو جیسی کہ چاہیے۔ اس نے تم کو پسند کیا اور دین میں تم پر کچھ مشکل نہیں رکھی۔ تمہارے باپ کا دین اسی نے تمہارا نام پہلے سے مسلمان رکھا اور اس قرآن میں تاکہ رسول تم پر بتانے والا ہو اور تم لوگوں پر بتانے والے۔

(الحج - ۷۸)

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ

اور اس طرح ہم نے تم کو معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو۔

(البقرۃ - ۱۴۳)

اور لوگوں پر گواہی کیا ہے۔ دین کی امانت سے عہدہ برآ ہونا اور اس کے عقائد، عبادات اور اخلاق و معاملات کو لوگوں تک پہنچانا۔

بہت سے ممالک رسولوں کے پیغامات سے دور ہیں۔

کچھ کھلم کھلا اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو بظاہر نسبت رکھتے ہیں اور بباطن دشمن۔

لیکن امتِ اسلامیہ کی ذمّے داری یہ ہے کہ وہ ظاہر و باطن دونوں طرح

اللہ تعالیٰ سے نسبت کو اپنے لیے عزت کا ذریعہ بنائے اور اللہ تعالیٰ کے قوانین کو زندہ کرنے کے لیے کوشاں رہے۔

حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مسلمانوں اور یہودیوں اور عیسائیوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کچھ لوگوں کو ایک مقررہ اجرت پر رات تک کام کے لیے رکھے۔ وہ لوگ دوپہر تک کام کرنے کے بعد کہنے لگیں ہمیں تمہاری اجرت کی ضرورت نہیں۔ جتنا کام ہم کرچکے ہیں اس کی اجرت نہیں مانگتے (لیکن اب کام نہیں کریں گے)۔ وہ شخص کہے: ایسا نہ کرو اپنا کام پورا کرلو اور پوری اُجرت لے لو۔ لیکن وہ نہ مانیں اور کام چھوڑ کر چلے جائیں۔

اس کے بعد وہ شخص کچھ دوسرے لوگوں کو اجرت پر رکھے اور کہے کہ اب جتنا دن بچا ہے اتنا کام کرلو تمھیں پوری وہی اجرت ملے گی جو پہلے کے لوگوں سے طے تھی، وہ لوگ عصر تک کام کرنے کے بعد کہیں: تم اپنی اُجرت اپنے پاس رہنے دو اب تک جتنا کام ہم کرچکے ہیں اس کی اُجرت بھی نہیں مانگتے (لیکن اب کام نہیں کریں گے) وہ شخص کہے۔ اپنا باقی کام پورا کرلو بس تھوڑا سا دن ہی تو باقی رہ گیا ہے۔ لیکن وہ نہ مانیں۔

تب وہ شخص کچھ دوسرے لوگوں کو اُجرت پر رکھے جو شام تک کام کریں اور جب سورج ڈوب جائے تو پہلے کے مزدوروں کی پوری اجرت بھی انھیں مل جائے۔

ان لوگوں (یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں) کی اور جتنی روشنی انھوں نے قبول کی اس کی مثال ایسی ہی ہے۔" (بخاری)

صورتِ حال کتنی واضح ہوجاتی ہے۔

یہودیوں کو توریت دی گئی کہ وہ اس پر عمل کریں اور اس میں جو حق نازل کیا گیا ہے اسی کی بنیاد پر لوگوں کے درمیان فیصلے کریں۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ الَّذِيۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِيۡنَ هَادُوۡا۔ (المائدۃ۔۴۴)	ہم نے توریت نازل کی کہ اس میں ہدایت اور روشنی تھی اسی پر حکم بردار پیغمبر حکم کرتے تھے یہود کو۔

اسی طرح عیسائیوں کو انجیل دی گئی کہ وہ اس پر خود بھی عمل کریں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس پر اکٹھا کریں۔

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ	اور انھیں کے قدموں پر ہم نے عیسیٰؑ بن مریم
مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ	کو بھیجا آگے سے موجود توریت کی تصدیق
مِنَ التَّوْرٰىةِ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ	کرنے والا بنا کر اور ان کو ہم نے انجیل دی
فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ	جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔

(المائدۃ - ۴۶)

یہ چراغ بہت جلد ان کے ہاتھوں میں بجھ گیا۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں نے نہ اپنے عہد کے ساتھ وفاداری نبھائی نہ بہت دنوں تک اپنے پیغام کی ذمّے داری اٹھائی۔

امتیں اپنے پیغام سے ہاتھ دھو لیتی ہیں جب ہدایت پر خواہشاتِ نفس کو غالب ہو جانے دیتی ہیں اور باطل کو اس کا موقع دے دیتی ہیں کہ وہ حق کو شکست دے دے ان کی (آسمانی) کتابیں ان کے پاس رہتی ہیں لیکن وہ بالکل معطل ہو کر طاق کی زینت بن کر، جیسے اقوامِ متّحدہ کے منشور کو بڑی دقیقہ سنجی کے ساتھ تیار کیا گیا تھا لیکن عملی طور پر بار بار اس کی خلاف ورزی ہوتی رہتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باطل، تحریف و تنسیخ و اضافہ کے راستوں سے خود ان کتابوں کی اصل عبارتوں میں داخل ہو جاتا ہے ایسی صورت میں حالت بالکل قابو سے باہر نکل جاتی ہے۔ گویا وہ شمعیں ہی گل کر دی گئی ہوں اور اندھیرا بالکل مسلّط ہو گیا ہو۔

تب دنیا کے سامنے سوائے پراگندہ خیالی اور پریشان حالی کے کوئی اور راستہ باقی نہیں رہ جاتا۔

حقیقت یہی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا دین کب کا ضائع کیا جا چکا اب اس کی جگہ جو کچھ ہے وہ کوئی اور ہی چیز ہے۔

کیا صیہونیت کا کوئی تعلق نبوتوں سے ہو سکتا ہے؟
یہی صورتِ حال حضرت عیسیٰؑ کے دین کے ساتھ بھی ہے۔
آج مسیحی دین کے نام پر جو کچھ بچا کھچا پایا جاتا ہے اس کا کوئی تعلق وحیِ الٰہی سے نہیں ہے نہ اس سے انسانوں کی خوش بختی ممکن ہے۔ اس مذہب کے لوگ اپنی اولین ذمّے داری سے کنارہ کش ہو چکے اور وحیِ الٰہی سے پیٹھ پھیر چکے۔
تب دنیا کو ایک نئی رسالت کی ضرورت ہوئی جس کے علمبردار از سرِ نو لوگوں کی ہدایت کا فریضہ سنبھالیں، اللہ کے نام پر ان کی رہنمائی کریں اور اس کام کو مکمل کریں جسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے اگلے لوگوں نے انکار کر دیا۔
امّتِ اسلامیہ اسی ضرورت کی تکمیل ہے۔
وہ جس حق کی علمبردار ہے اسے قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے جب تک روئے ارض پر زندگی باقی ہے ایمان کے حقائق اور حکمتِ عالیہ کے مقررہ طریقوں میں کوئی تبدیلی اور خلل پیدا نہیں ہو سکتا۔
اگر کچھ لوگ اس ذمّے داری کو نبھانے سے انکار بھی کرتے ہیں تب بھی اہلِ قرآن ایسی غلطی نہیں کر سکتے نہ اس طرح کی کسی غلطی کو برداشت کر سکتے ہیں۔
پچھلے زمانوں کی طرح شیطان کو اب حق کے نشانات کو مٹانے کا موقع نہیں مل سکتا۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"پچھلی امتوں کے مقابلے میں (روئے ارض پر) تمہاری بقا کی مدت ایسی ہی ہے جیسے عصر سے مغرب تک۔
اہلِ توریت کو توریت دی گئی تو انھوں نے دوپہر تک اس پر عمل کیا پھر رُک گئے انھیں ایک ایک قیراط کے برابر اجرت دی گئی۔
پھر اہلِ انجیل کو انجیل دی گئی تو انھوں نے عصر کے وقت تک کام کیا پھر رُک گئے۔ انھیں بھی ایک ایک قیراط کے برابر اجرت دی گئی۔

پھر ہمیں قرآن دیا گیا تو ہم نے سورج ڈوبنے تک کام کیا اور ہمیں دو دو قیراط کے برابر اجرت دی گئی۔

توریت اور انجیل والوں نے عرض کیا: اے پروردگار! آپ نے انھیں دو دو قیراط کے برابر اجرت دی اور ہمیں ایک ایک قیراط کے برابر۔ جبکہ ہم نے زیادہ کام کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا میں نے تمہاری اجرت کے سلسلے میں کوئی ظلم کیا؟

انھوں نے عرض کیا: نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تو میرا فضل ہے جسے چاہوں دوں" (بخاری)

کیا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے طرفداری ہے؟

ہرگز نہیں، یہ تو کام کی ذمّے داری ہے جس نے اپنی ذمّے داری پوری نہیں کی اسے زیادہ اجرت کیسے مل سکتی ہے؟

امتِ اسلامیہ محض اللہ تعالیٰ سے نسبت کی زبانی دعویدار نہیں۔

یہ امت صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکتی ہے اور بس۔

یہ امت خوشحالی و تنگدستی میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی طرف رجوع نہیں کرتی۔

یہ امت حکمِ الٰہی کی پیرو کار ہے اسی کے مطابق زندگی گزارتی ہے۔

یہ امت اپنے باطن کو تقویٰ سے، اپنے سلوک و معاملہ کو عدل و انصاف سے اور اپنے مقاصد کو آخرت کے حقائق سے ہم آہنگ و مزیّن کرتی ہے۔

اسی امت کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرے۔

اگر کوئی تہذیب اس میں کامیاب ہو جائے کہ وہ دنیا کو ایسے محلوں سے بھر دے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں پھر اس کے باشندے اپنے پروردگار کی تنظیم نہ کریں، اس سے ملاقات کی تیاری نہ کریں، اس کی حمد و ثنا نہ کریں اور اس کی بزرگی کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کریں تو ایسی تہذیب بے قیمت ہوگی اور ذرّہ برابر احترام کی حقدار نہیں ہوگی۔

بہت سی قوموں نے اللہ تعالیٰ سے نسبت کا دعویٰ کیا لیکن دنیا پرستی سے کنارہ کشی نہیں اختیار کی نہ طلبِ آخرت کی کوشاں ہوئیں اور نہ اس کے لیے تواضع، بھلائی اور اصلاح

کا راستہ اپنایا۔ تو ان کا انجام کیا ہوا؟

اس نسبت کو مسترد کر دیا گیا اور جس سزا کے وہ مستحق تھے وہ ان پر نازل ہوئی۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ ۚ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُم ۖ بَلْ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ۔

(المائدۃ - ۱۸)

اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں تو کہو کہ پھر وہ کیوں تمہارے گناہوں پر تم کو عذاب دیتا ہے۔ کوئی نہیں بلکہ تم بھی اس کی مخلوق میں ایک آدمی ہو وہ جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے عذاب دے اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ دونوں کے بیچ میں ہے اس کی سلطنت ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

امّتِ اسلامیہ کبھی الٰہی ہدایت سے کنارہ کشی نہیں اختیار کر سکتی۔

اس لیے رسالت کے ساتھ اس کی نسبت کی عزت برقرار رہے گی۔ اور جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے لیے مخلص رہے گی، اس کی حمد و ثنا کرتی رہے گی اور اپنے اعمال سے اس کی خوشنودی کے حصول کے لیے کوشاں رہے گی وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ سے نہیں گرے گی۔

اس امت کی کتاب قرآن کریم کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے اس میں کوئی تحریف نہیں ہو سکتی۔

سنّتِ نبویہ میں اس کی تشریح و تفسیر موجود ہے اور علماء اس کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔

یہ تو نظریاتی پہلو ہے۔ عملی اعتبار سے کسی بھی علاقہ اور زمانہ میں امت زندگی کو حق کے ساتھ ہم آہنگ کرنے اور اس کے تابع کرنے سے بالکل کنارہ کش نہیں ہوئی۔

خرافات و اوہام پھیل سکتے ہیں، گناہ اور ظلم کا صدور ہو سکتا ہے اور یہ زندگی

میں کوئی انوکھی بات نہیں لیکن اہلِ ایمان ان کی مزاحمت کر کے تلافی کرتے رہتے ہیں جس سے یا تو ان کا بالکل قلع قمع ہو جاتا ہے یا کم از کم ان کی برائی محدود ہو جاتی ہے۔

کبھی ایک علاقہ میں ان کوششوں کو پسپائی کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے تو کسی دوسرے علاقہ میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔

کبھی کسی وقت پیچھے ہٹنا پڑتا ہے تو دوسرے وقت پیش قدمی حاصل ہو جاتی ہے۔ کتاب وحی میں موجود حق اور جدّو جہد کرنے والوں کی زندگی میں اس کے اثرات کی آگ بالکل کبھی نہیں بجھتی۔

حدیث میں آتا ہے:

"میری امت کے کچھ لوگ حق پر قائم رہیں گے یہاں تک کہ اسی حال میں اللہ کا حکم (قیامت) آجائے۔" (مسلم)

حق پر قائم رہنا صرف بلیغ تقریروں اور بہترین کتابوں ہی میں نہیں ہوتا اس کا اظہار حالات اور اعمال میں اور ہدایتِ الٰہی کے مطابق معاشرے کی تشکیل اور اس کے خاص و عام معاملات میں ہوتا ہے۔

اسلام کسی ایسی امت کا عنوان نہیں ہو سکتا جو پستی کا شکار یا سرکش ہو یا جو زندگی میں اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے طرزِ عمل اور غلط رخ اختیار کرے۔ اسلام تو دل کی گہرائیوں اور معاشرے کے گوشے گوشے میں نمایاں ان حقائق کا نام ہے جو دن رات اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتے ہیں، اس کی فرماں برداری پر زور دیتے ہیں، اس سے ڈرنے پر آمادہ کرتے ہیں اور اس کے لیے اخلاص پر ابھارتے ہیں۔

مرد و عورت کی باہمی زندگی

کیا جنسی ضرورت ایک شیطانی عمل ہے؟
کچھ لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے قرب حاصل کرنے کے لیے اس ضرورت کے تقاضوں کو دبا دینا ضروری ہے۔
اس لیے رہبانیت کو انسانی سربلندی کا ایک بڑا درجہ اور اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس کی خوشنودی کے حصول کی کوشش کا ایک بڑا ثبوت مانتے ہیں۔
اسلام اس خیال کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کے نتائج کو کلی طور پر مسترد کرتا ہے وہ دینِ فطرت ہے، وہ انسانی فطرت کا تحفظ کرتا ہے اسے مٹاتا نہیں۔ وہ جنسی رجحان کو ایسا ہی سمجھتا ہے جیسے معدہ کی رغبت کھانے کی طرف۔
اس رغبت کا انکار نہیں کیا جا سکتا البتہ اس کی تکمیل کے لیے کچھ باتوں کا لحاظ ضروری ہے مثلاً یہ کہ کھانا حلال و پاک ہو، حرام و ناپاک نہ ہو۔
کھانا حاصل کرنے کی انسانی کوشش قابلِ فہم ہے لیکن اس پر اللہ تعالیٰ کا حق بھی ہے کہ وہ مثلاً مردار، خون اور خنزیر وغیرہ نہ کھائے۔
اور یہ بھی اللہ کا حق ہے کہ وہ جائز چیزوں کو ناجائز طریقوں مثلاً چوری، ڈکیتی، رشوت اور فریب دہی وغیرہ سے نہ حاصل کرے۔
یہی صورت جنسی ضرورت کے ساتھ بھی ہے۔
اسلام اس کے تقاضوں سے انکار نہیں کرتا اور نہ لوگوں کو منع کرتا ہے کہ وہ یہ

تقاضے پورے کریں البتہ اس کے لیے کچھ حدود مقرر کرتا ہے۔

اگر حلال و پاک ذریعے سے یہ ضرورت پوری ہو تو پھر کوئی حرج باقی نہیں رہتا۔

جس طرح اللہ کا نام لے کر انسان کھانا کھاتا ہے اسی طرح اس کا نام لے کر اپنی بیوی کے ساتھ ضرورت بھی پوری کرتا ہے۔

نیک نیتی کے ساتھ یہ عام کام شہوت کے بجائے عبادت بن جاتے ہیں۔

مسلم فقہاء نکاح کو اطاعتوں میں شمار کرتے ہیں اور زکاۃ و حج کے بعد ہی اس کے احکام کا باب قائم کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دور میں کچھ لوگوں نے رہبانیت کو دین اور شادی سے گریز کو عبادت بنانے کی کوشش کی ـــــ غالباً دوسرے مذاہب سے متاثر ہو کر یہ رجحان ہوا تھا ـــــ تو جب یہ خبر آپؐ کے پاس پہنچی تو آپ نے اسے سختی سے مسترد کر دیا کیونکہ یہ مسلک جسم کے فطری تقاضوں کے خلاف تھا۔

اور اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ یہ ایک پوشیدہ شدید خواہش کے خلاف جدّ و جہد ہے تو بھی اس معرکہ میں کامیابی کی کوئی قیمت ہے نہ اس سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا کوئی تعلق ہے۔

کبھی کبھی اس کے شخصی اور معاشرتی نتائج تباہ کن ہو جاتے ہیں۔

اسی لیے شادی اسلام کے طریقوں میں سے ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ "کچھ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہراتؓ کے گھر آئے اور آپ کی عبادت کے بارے میں دریافت کیا۔

جب انھیں بتایا گیا تو ایسا لگا کہ جیسے وہ اسے کم سمجھ رہے ہوں اور کہنے لگے ہمارا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کیا مقابلہ، آپؐ کے تو اگلے پچھلے گناہ معاف ہو چکے ہیں۔

ایک کہنے لگا: میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھتا ہوں۔

دوسرا کہنے لگا: میں ہمیشہ روزے سے رہتا ہوں۔

تیسرا کہنے لگا: میں ہمیشہ عورتوں سے دور رہتا ہوں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا:

تمہیں لوگ ایسا ایسا کہہ رہے تھے؟ خدا کی قسم میں تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور تقویٰ رکھنے والا ہوں لیکن میں روزے بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں۔ تو جو میری سنّت سے انحراف اختیار کرے وہ مجھ سے تعلّق رکھنے والا نہیں۔" (بخاری)

حضرت انس ہی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے جسے نیک بیوی دی اسے اس کے نصف دین میں مدد پہنچا دی اب باقی نصف کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔" (طبرانی)

○

اسلام جس طرح رہبانیت کو مسترد کرتا ہے اسی طرح جنسی ضرورت کی تکمیل کے لیے انسان کو بے لگام چھوڑنے اور حدود سے تجاوز کرنے کو بھی مسترد کرتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ زنا بہت بڑی بُرائی ہے اور اسلام اس ذلت تک پہنچانے والے تمام راستوں کو بند کرتا ہے۔

اور جو اس کا ارتکاب کرتے ہیں انھیں قاتلوں اور رہزنوں کی طرح مجرم قرار دیتا ہے جب تک مغربی تہذیب کے علم بردار جنسی ضرورت کے تعلق سے اپنے بے لگام خیالات پر باقی رہتے ہیں ان کے اور ہمارے درمیان اختلاف برقرار رہے گا۔

اسلام جسم کی ضرورتوں کو تسلیم کرتا ہے اور ان ضرورتوں کی تکمیل کے لیے جائز حدود میں مواقع فراہم کرتا ہے لیکن اسراف و حماقت کی چھوٹ نہیں دیتا۔

لوگوں کے جسموں کو جتنی حرارت غریزی کی ضرورت ہوتی ہے اس سے کچھ زیادہ یا کم کھانا کھاتے ہیں لیکن پیٹ کو جس کھانے کی بھی خواہش ہو اسے مہیا کیا جائے اسے نہ دین تسلیم کرتا ہے نہ شرافت۔

جو لوگ کھانے کی میزوں پر ٹوٹ پڑیں اور معدے کی طاقت سے زیادہ اس میں کھانا ٹھونس لیں ـــــ چاہے وہ ان کی اپنی کمائی ہی کا ہو ـــــ وہ فضول خرچی کے مرتکب ہوں گے اور دنیا و آخرت میں اس کے انجام سے ڈرنا چاہیے۔

اور اگر یہ کمائی لوٹ مار اور حرام کی ہو تب کیا انجام ہوگا؟

یہی حال جنسی ضرورت کا بھی ہے حلال طریقہ سے اسے پورا کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن اس ضرورت کو اشتعال دلا دلا کر بڑھانا کہاں کی عقل مندی ہوگی؟

آخر عورت کو بنا سنوار کر ہر جگہ موجود رکھنے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے؟

اس طرح کی لذت پرستی کی پیاس کبھی بجھ سکتی ہے؟

اس طرح تو حیوانی جذبات کی آگ کو بھڑکانا ہوا اور دلوں میں ڈر پیدا کرنے والا ایمان بھی مفقود ہو تو ان جذبات کو آخر کس طرح قابو میں رکھا جا سکتا ہے؟

اسی لیے عورت کو اپنی زیب و زینت ظاہر کرنے سے روکا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو نگاہیں جھکا لینے اور شرمگاہوں کی حفاظت کرنے کا حکم دینے کے بعد فرماتا ہے:

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ

اور اے نبیؐ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے: شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے، اپنے میل جول کی عورتیں، اپنے لونڈی غلام، وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں اور

الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ۔ (النور۔ ۳۱)

وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔

اور

وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (النور۔ ۳۱)

اور وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔ اے مومنو! تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو۔ توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے۔

یعنی دوپٹہ اس طرح اوڑھیں کہ سینہ کا اوپری حصّہ بھی ڈھک جائے۔ پھر چلنے میں اعتدال اختیار کریں تاکہ نچلے حصّے کی زینت نہ ظاہر ہو سکے۔

آج جو کچھ تقریبات میں اور سڑکوں اور تفریح گاہوں میں دکھائی دیتا ہے اسلام اسے بالکل پسند نہیں کرتا۔



آج دنیا شدید جنسی گناہوں میں ڈوب رہی ہے اور اس کا اولین سبب یہی ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان تعلق کے سلسلے میں حکمِ الٰہی کو نظر انداز کیا جا رہا ہے ہم صاف کہنا چاہتے ہیں کہ؛

اسلام نوجوان مردوں اور عورتوں کے اس اختلاط کو ناپسند کرتا ہے جو "جائز ریاضت" کے نام پر رقص گاہوں میں ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"تم میں سے کسی کے سر میں لوہے کی کنگھی پھیری جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی عورت کو چھوئے جو اس کے لیے حلال نہ ہو۔" (طبرانی)

اسلام مردوں اور عورتوں کی مشکوک خلوتوں کو بھی ناپسند کرتا ہے چاہے اسے جو بھی نام دیا جائے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں؛
"کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ خلوت میں ہوتا ہے تو ان کا تیسرا ساتھی شیطان ہوتا ہے۔" (منذری)

محبت کے نام پر، پسندیدگی کے نام پر یا کسی اور عنوان سے یہ ہرگز جائز نہیں کہ نوجوان مرد اور عورت کے درمیان عشقیہ باتوں یا بوسوں کا تبادلہ ہو کیونکہ یہ جرم کی تمہید بن جاتا ہے۔ اسلام اس طرح کی تمہیدوں کو بھی گناہ قرار دیتا ہے۔

جو نگاہ عورتوں کا تجسس کرے وہ بھی زنا کی مرتکب ہے، جو ہاتھ ان کے جسموں کو ٹٹولیں وہ بھی زنا کے مرتکب ہیں اور جو بھی اس طرح کی کوئی چیز کرے گا گناہ گار ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"آنکھوں کا زنا (اجنبی عورتوں پر) نگاہ ڈالنا ہے۔ کانوں کا زنا (ان کی باتیں) سننا ہے، زبان کا زنا (ان سے) بات کرنا ہے، ہاتھ کا زنا (انھیں) پکڑنا ہے، پیروں کا زنا (گناہ کی طرف) چلنا ہے۔ دل میں خواہش و تمنا پیدا ہوتی ہے اور اس کو پورا کرنا یا نہ کرنا شرم گاہ کا کام ہے۔" (بخاری)

مسلم کی ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ "منھ کا زنا بوسہ ہے"

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ہر گناہ گارانہ تصرّف کی مناسب سزا رکھی ہے۔ انسان برائی کی نیت سے جو بھی حرکت کرے گا اس کی سزا ضرور ملے گی۔

اس سختی کا مقصد جرائم کے دروازے بند کرنا ہے۔

طبعی رجحان کے نام پر فحش کی ہلاکت میں پڑنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو میرے سامنے اخبار کی ایک خبر ہے کہ "برطانیہ کے ترقی پسند سماج میں پہلی مرتبہ فلاح و بہبود کے لیے ایک ایسا بڑا پروگرام منعقد کیا جا رہا ہے جس میں پیرس کی ایک مشہور رقاصہ حاضرین کے سامنے رفتہ رفتہ اپنے کپڑے اتار کر مادر زاد ننگا جسم دکھلائے گی اور پھر اس کے اتارے ہوئے ایک ایک کپڑے کو علاحدہ علاحدہ نیلام کیا جائے گا۔ اس پروگرام میں برطانیہ کی ممتاز شخصیات شریک ہوں گی۔

پروگرام یورپ کے پناہ گزینوں کی مدد کے لیے منعقد کیا جا رہا ہے۔"

یہ اس قوم کے شعور کا عالم ہے جس نے اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دیا ہے اور اس کی حدود کو پامال کر چکی ہے اور مشرق و مغرب میں یہی کلچر پھیلانے پر کمربستہ ہے۔

لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ	کیوں ان کے علماء اور مشائخ انھیں گناہ پر
عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ	زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے
لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۔	یقیناً بہت ہی برا کارنامہ زندگی ہے جو وہ
(المائدۃ ۔ ۶۳)	تیار کر رہے ہیں۔

اخلاق پسند مشرق کو اس اجتماعی زوال سے دور رہنا چاہیے۔

خاندان

خاندان، مرد و عورت، دونوں جنسوں کا فطری ٹھکانہ اور دونوں کے پاکیزہ تعلقات کا واحد ذریعہ ہے۔

انسان تنہا ادھورا ہے دوسری صنف سے مل کر ہی پورا ہوتا ہے۔

اگر ہم صحیح نقطہ نظر سے دیکھیں تو جنسی خواہش کی حیثیت خاندان کی تشکیل میں ثانوی ہے۔

اس کی اصل اور شریفانہ بنیاد محبت، انسیت اور باہمی الفت کی بنیاد پر قائم ہونے والی صحبت و رفاقت ہے۔

اسی بنیاد کی طرف قرآن کریم اشارہ کرتا ہے:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا۔	وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس آرام حاصل کرے۔
(الاعراف۔ ۱۸۹)	

اس سکون کا مطلب یہ ہے کہ مرد مستقل طور پر یہ محسوس کرے کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے جس سے وہ راحت حاصل کر سکتا ہے، اس کی رفاقت میں اپنا رنج و غم بھولتا ہے اور تنگی کے وقت اس سے دل کو خوشی و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

شادی کا یہ مطلب سمجھنا کہ وہ محض جنسی بندھن ہے ذہن و شعور کی گراوٹ کی دلیل ہے۔ معاملہ اس سے کہیں زیادہ اہم اور بڑا ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْۤا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً۔ (الروم۔ ۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لیے تمہاری ہی قسم سے جوڑے بنا دیے کہ چین سے رہو ان کے پاس اور تمہارے درمیان پیار اور مہربانی رکھی۔

اس روحانی حقیقت کی بنیاد پر گھرانوں کی تشکیل کافی تربیت، یا زیادہ صحیح تعبیر کے مطابق اخلاق و دینداری چاہتی ہے۔

میاں بیوی کے تعلقات بہت گہرے اور وسیع نوعیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے اسلام ان کے تحفظ اور ظاہری و باطنی اعتبار سے ان کی اصل خصوصیت کی حفاظت پر زور دیتا ہے۔

ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ۔ (البقرۃ ۔ ۱۸۷)

وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔

حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت کے دن بدترین شخص وہ مرد ہوگا جو اپنی عورت سے راز کی باتیں کرے اور وہ عورت اس سے راز کی باتیں کرے پھر وہ مرد وہ باتیں اِدھر اُدھر پھیلا دے۔" (ابوداؤد)

بیوی کے ساتھ خوش اخلاقی ایمان کی علامتوں میں سے ہے۔

"تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم میں سب سے بہتر ہوں۔" (حاکم)

"مسلمان مرد جو کھیل بھی کھیلتا ہے وہ بیکار ہے سوائے تیراندازی کے اور اپنے گھوڑے کو سدھارنے کے اور اپنی بیوی سے کھیل کے۔ یہ درست چیزیں ہیں۔" (ترمذی)

دیکھیے میاں بیوی کے درمیان خاص انسانی تعلق کو کس طرح حق ٹھہرایا گیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مزید فرماتے ہیں:

"دنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے"۔ (مسلم)

اس طرح کی نصیحتوں سے آپؐ نے مرد کو سمجھایا کہ زندگی میں ساتھی بنانے اور اپنی ذمہ داریوں کی ادائگی میں مدد حاصل کرنے کے لیے سب سے بہتر ایسی بیوی ہوتی ہے جو بہترین اخلاق والی ہے یا جس کی صفت ایک دوسری حدیث میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

"جس پر (شوہر) اگر نگاہ ڈالے تو وہ اسے خوش کر دے، اگر اسے کوئی حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور خود اپنے تعلق سے اور اس کے مال کے بارے میں کوئی ایسا تصرف نہ کرے جو (شوہر کو) ناپسند ہو" (ترمذی)

بلاشبہ اس طرح کی بیوی نیک بخت گھرانے کا بنیادی ستون ہوتی ہے۔

خاندان کے درمیان تعلقات مرنے کے بعد ختم نہیں ہو جاتے۔ اگر اس دنیا میں موت ان کا شیرازہ منتشر کر دے تب بھی وہ آخرت میں پھر جمع ہو جاتے ہیں۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ۔ (الرعد۔ ۲۳)

رہنے کے باغ جن میں وہ خود داخل ہوں گے اور ان کے باپ دادوں اور بیویوں اور اولاد میں جو نیک ہوئے وہ بھی۔

اسی طرح:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ (الطور۔ ۲۱)

اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد ان کی راہ پر چلی ایمان سے۔ ہم نے ان کی اولاد کو ان تک پہنچا دیا اور ہم نے ان سے ان کا کیا ذرا بھی گھٹایا نہیں۔

اور جس طرح ایمان رکھنے والا خاندان جنّت کی نعمتوں میں اکٹھا ہوگا اسی طرح انکار کرنے والے خاندان عذاب میں یکجا ہوں گے۔

اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

جمع کرو گنہگاروں کو اور ان کے جوڑوں کو اور جو کچھ اللہ کے سوا وہ پوجتے تھے پھر ان کو

فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ دوزخ کی راہ پر چلاؤ۔

(الصافات - ۲۲ - ۲۳)

کتنی عجیب بات ہے کہ یہ انسانی تعلقات برقرار رہیں گے۔

لیکن ازدواجی زندگی کی نوعیت کو سمجھا جائے تو تعجب کی صورت باقی نہیں رہ سکتی۔ اس کی بنیاد دوستی و رفاقت کے جذبہ سے بھی بلند تر ان جذبات پر قائم ہوتی ہے جو میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے رکھتے ہیں پھر ان کے زیرسایہ آنے والی نسلیں پروان چڑھتی ہیں۔

اولاد کی پرورش اور تربیت کے لیے خاندان سے زیادہ صاف ستھرا اور مناسب کوئی اور ماحول نہیں مل سکتا۔

مادرانہ محبت اور پدرانہ شفقت ــــ جو سب سے مضبوط اور گہرے انسانی احساسات ہوتے ہیں ــــ ان کی کفالت و نگہداشت کرتے ہیں اور انتہائی صبر کے ساتھ ان کو پروان چڑھاتے ہیں۔

اسی لیے خاندان کا تحفظ اہم ترین ذمے داریوں میں سے، اور اس کا راستہ ہموار کرنا ثواب کے بہترین کاموں میں سے ہے۔



چونکہ گھر کے اخراجات، میاں بیوی کو پیش آنے والے مسائل میں، سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور اس بوجھ کو اٹھانے کی ذمہ داری مرد پر ہونے کی وجہ سے اسے زیادہ دقت پیش آتی ہے اس لیے بسا اوقات اس میں اختلاف رائے پیدا ہوجاتا ہے کہ کس چیز پر خرچ کیا جائے اور کس خرچ کو روکا جائے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے واضح فرما دیا ہے کہ گھر کے ضروری اخراجات ضائع ہونے والی چیز نہیں بلکہ ان کا اجر و ثواب باقی رہتا ہے۔

"جو دینار تم نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا، جو دینار کسی غلام کو آزاد کرانے میں خرچ کیا، جو دینار کسی مسکین کو صدقہ میں دیا اور جو دینار اپنے گھر والوں پر خرچ کیا۔

ان میں سے سب سے زیادہ اجر و ثواب والا دینار وہ ہے جو تم نے اپنے گھر والوں پر خرچ کیا۔" (مسلم)

اس ہدایت پر خاص توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ بعض لوگ اپنے آل اولاد کے مفادات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جبکہ دوسری جگہوں پر خرچ کرتے ہیں۔

اسلام گھر کی کفالت اور اس کی ضروریات کی فراہمی کو ایک اہم ذمّے داری قرار دیتا ہے۔

البتہ گھر کی ضروریات کے بارے میں کوئی حتمی حدود تفصیل بیان نہیں کی جا سکتی۔ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں اس بات پر تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو چکی ہے کہ امہات المومنینؓ زیادہ خرچ طلب کر رہی تھیں جبکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے اس میں دشواری تھی۔

اسلام اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ خرچ کے معاملہ کو پورے خاندان کو مشکلات میں مبتلا کرنے اور اس کے مستقبل کو خطرے میں ڈالنے کا سبب بنایا جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا۔

(الطلاق - ۷)

کشادگی والا، اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس کی روزی تنگ ملتی ہے تو جیسا کہ اسے اللہ نے دیا ہے (اس کے مطابق) خرچ کرے۔ اللہ کسی پر اسی قدر بوجھ ڈالتا ہے جو اس کو دیا ہے جلد ہی اللہ سختی کے پیچھے آسانی کر دے گا۔

اور یہ حکم الٰہی ان بہت سے احکام کے بعد آیا ہے جن میں حسنِ اخلاق اور تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور اس کا پس منظر گھروں میں پیدا ہونے والے اختلافات ہیں جن سے خاندان کو جوڑنے والے روابط ہی متاثر ہو جاتے ہیں۔

فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ   تو ان کو دستور کے مطابق رکھو یا دستور کے

فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ۔

(الطلاق ۔ ۲)

مطابق چھوڑ دو اور اپنے میں سے دو معتبر گواہ کرلو اور اللہ کے واسطے گواہی سیدھی ادا کرو۔

ذٰلِكُمْ یُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۬ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ۔ وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ۔

(الطلاق ۔ ۲ - ۳)

یہ بات جو ہے اس سے جو کوئی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہوگا، سمجھ جائے گا اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کا گزارہ کر دیتا ہے اور جہاں سے اسے خیال بھی نہ ہو وہاں سے اسے روزی دیتا ہے۔ اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ رکھے تو وہ اس کو کافی ہے۔ اللہ اپنا کام پورا کر لیتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کا اندازہ رکھا ہے۔

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ یُسْرًا ۔

(الطلاق ۔ ۴)

اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا رہے وہ اس کے کام میں آسانی کر دیتا ہے۔

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یُكَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَیُعْظِمْ لَهٗ اَجْرًا ۔

(الطلاق ۔ ۵)

اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا رہے اللہ اس پر سے اس کی برائیاں اتار دیتا ہے اور اس کو بڑا ثواب دیتا ہے۔

شادی آزادانہ بندھن ہے

خاندان کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے اسلام نے یہ اصول بتا دیا ہے۔
شادی دو بالکل بااختیار فریقوں کے درمیان ایک آزادانہ بندھن ہے۔
نہ مرد کو اس پر مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ جسے پسند نہیں کرتا اس سے شادی کرے۔
اور نہ عورت کو اس پر مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ جس سے نفرت کرتی ہے اسے قبول کرے۔
کبھی ایسا ہو جائے کہ لڑکی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر دی گئی تو اسلام کی نگاہ میں اس جبر کی کوئی قیمت نہیں۔

حضرت خنسارؓ بنت حزام سے روایت ہے کہ ان کے والد نے ان کی شادی ایسے شخص سے کر دی جو انھیں پسند نہیں تھا۔ تو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس معاملہ لے گئیں۔ آپؐ نے اس نکاح کو مسترد کر دیا۔ (بخاری)

ایک روایت میں ہے کہ ایک لڑکی رسول اللہؐ کے پاس آئی اور عرض کیا کہ "اس کے والد نے اس کی شادی ایسی جگہ کر دی ہے جو اسے پسند نہیں آپ نے اسے اختیار دیا کہ وہ چاہے تو مان لے ورنہ مسترد کر دے۔" (احمد)

ایک روایت میں ہے "اس نے عرض کیا کہ میرے والد نے لالچ کی وجہ سے میری شادی اپنے بھتیجے سے کر دی ہے اور مجھے وہ پسند نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو اپنے والد کی بات مان لو اور اگر نہ چاہو تو منسوخ کر دو۔

اس نے عرض کیا کہ: میں نے اپنے والد کی بات مان لی لیکن میں نے ایسا اس لیے کیا کہ عورتیں یہ جان لیں کہ باپوں کو اس میں زبردستی کرنے کا حق نہیں ہے۔" (بخاری)

ہاں باپ اور ولی کو اس کا عمومی حق ہے کہ اگر لڑکی اپنے بارے میں کوئی غلط تصرف کر بیٹھے مثلاً کسی دھوکے باز یا ناچنے گانے والے جیسے گھٹیا شخص سے شادی

کرنا منظور کرے تو وہ اعتراض کر سکیں۔

لڑکیاں اکثر اپنے بھولے پن میں دھوکے بازوں کے جال میں پھنس جاتی ہیں۔ اگر کفو کے ساتھ عقد نہیں ہوتا تو ولی کے اعتراض کے بعد قاضی اسے فسخ کر دے گا۔

اسلام نے عورتوں کو اجازت دی ہے کہ وہ معقول حد کے اندر تصرّف کریں۔

لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ — تم پر اس بات میں کچھ گناہ نہیں کہ وہ اپنے حق میں قاعدہ کے موافق (نکاح) کریں۔

(البقرہ - ۲۳۴)

اور اسلام میں کفارت دین واخلاق میں ہے۔ حسب نسب اور دولت میں نہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"اگر تمہارے پاس کوئی ایسا شخص پیغام لائے جس کی دینداری اور امانتداری سے تم مطمئن ہو تو اس سے شادی کر دو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو روئے زمین پر فتنہ اور زبردست بگاڑ پیدا ہو گا (یہ بات آپؐ نے تین مرتبہ فرمائی) (ترمذی)

مرد گھر کا ذمّے دار ہے

شریعتِ الٰہی میں مرد گھر کا ذمّے دار اور خاندان کو چلانے والا ہے۔ اور اس میں شرف و مرتبہ سے کہیں زیادہ ذمّے داری کا پہلو ہے۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ گھر ایک مستحکم نظام کے مطابق چلے۔ متضاد خواہشات اور رجحانات کے ٹکراؤ کا شکار نہ ہو جائے۔

کوئی کمپنی بغیر ذمّے دار سربراہ کے ہو، اس کا تصوّر بھی فضول ہوگا۔

عورت کے سر گھر کی ذمّے داری ڈالنا ایک کمزور کندھے پر بھاری بوجھ ڈالنا ہوگا۔

گھر کو چلانے اور خاندان کے سربراہی کے زیادہ لائق مرد ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے کمانے، خرچ کرنے اور تحمل و پامردی سے حالات کا مقابلہ کرنے کی زیادہ صلاحیت دی ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء۔ ۳۴)

مرد عورتوں پر قوّام (ذمے دار) ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

کسی کسی گھرانے میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت مرد سے زیادہ باصلاحیت ہوتی ہے ایسی صورت میں سربراہی مرد سے چھن جاتی ہے یا وہ خود اس سے دستبردار ہو جاتا ہے اور سربراہی عورت کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔

لیکن ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے، اسے عام قاعدہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ فطری بات یہی ہے کہ زندگی اپنی فطری رفتار سے چلتی رہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے موافق۔ اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔ (البقرة - ۲۲۸)

اس رہنما اصول کے ساتھ اسلام نے ایسی بہت سی تعلیمات دی ہیں جن میں مرد پر عورت کے حقوق اور عورت پر مرد کے حقوق واضح کیے گئے ہیں، اور جن سے خاندان میں نیکی و تقویٰ اور محبت و تعاون کا ماحول پیدا ہوتا ہے اور ازدواجی زندگی کے استحکام، اولاد کی اچھی پرورش اور نفسیاتی سکون و خوش بختی کی ضمانت ملتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مردوں کو سکھایا جائے کہ عورتوں کے کیا کیا حقوق ہیں اور ان سے وفاداری اور عزت کا سلوک کس طرح کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح عورتوں کو سکھایا جائے کہ مردوں کے حقوق کیا کیا ہیں اور کس طرح ان کا احترام و عزت کی جانی چاہیے۔

حضرت میمون کردی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"جس مرد نے بھی کسی عورت سے کم یا زیادہ جتنی بھی مہر پر شادی کی اور اس کے دل میں یہ تھا کہ وہ اس کا حق ادا نہیں کرے گا تو اسے دھوکا دیا اور موت تک ادا بھی نہیں کیا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے بحیثیت زنا کار پیش ہوگا۔

اور جس شخص نے بھی قرض لیا اور اسے ادا کرنے کی نیت نہیں تھی تو اس نے اسے دھوکا دیا اور موت تک ادا نہیں کیا وہ اللہ کے سامنے بحیثیت چور پیش ہوگا۔"

(طبرانی)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"تم میں سے ہر ایک ذمے دار ہے اور جس کا ذمہ دار ہے اس کے سلسلے میں

جوابدہ ہے، امام ذمّے دار ہے اور اپنی رعایا کے بارے میں جواب دہ ہے، مرد اپنے گھر والوں کا ذمّہ دار ہے اور ان کے بارے میں جوب دہ ہے، عورت اپنے شوہر کے گھر کی ذمّہ دار ہے اور اس کے بارے میں جواب دہ ہے، خادم اپنے آقا کے مال کا ذمّے دار ہے اور اس کے بارے میں جواب دہ ہے۔ (الغرض) تم میں سے ہر ایک ذمّے دار ہے اور اپنی ذمّے داری کے سلسلے میں جوابدہ ہے۔ (بخاری)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مومنین میں سب سے کامل ایمان اس کا ہے جو سب سے بہتر اخلاق والا اور اپنے گھر والوں کے سلسلے میں سب سے نرم ہو" (ترمذی)

حضرت معاویہؓ بن حیرہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم میں سے کسی کی بیوی کا اس پر کیا حق ہوتا ہے؟

آپؐ نے فرمایا: کھانے کی ضرورت ہو تو اسے کھانا کھلاؤ، لباس کی ضرورت ہو تو اسے لباس مہیّا کرو، چہرے پر نہ مارو نہ بگاڑو، اور گھر کے اندر کے علاوہ اس سے کنارہ کشی نہ کرو" (ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عورت اگر پانچوں نمازیں پڑھ لے، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرلے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے تو جنّت کے جس دروازے سے چاہے اس میں داخل ہو جائے"

(ابن حبان)

حضرت ابن عبّاس سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں آپ کے پاس عورتوں کی نمائندہ بن کر آئی ہوں (عرض یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے مردوں پر تو یہ جہاد فرض کیا ہے۔ اگر وہ کامیاب ہوتے ہیں تو انھیں اجر ملتا ہے اور اگر قتل ہو جاتے ہیں تو اپنے رب کے پاس زندہ رہتے ہیں اور رزق پاتے ہیں۔ اور ہم عورتیں (ان کے گھروں کی) دیکھ بھال کرتی ہیں تو ہمیں اس میں سے کیا اجر ملے گا؟

آپؐ نے فرمایا: عورتوں میں سے تمہیں جو بھی مل جائے اسے بتادو کہ شوہر کی

اطاعت اور اس کے حق کا اعتراف اس (جہاد) کے برابر ہے اور تم میں سے کم ہی ایسا کرتی ہیں۔" (بزار)

حضرت زیدؓ بن ارقم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"عورت اس وقت تک اللہ تعالیٰ کا حق ادا نہیں کرتی جب تک اپنے شوہر کا حق ادا نہ کرے۔ یہاں تک کہ اگر وہ اس سے خواہش ظاہر کرے اور وہ کھانا پکانے میں مشغول ہو تو بھی انکار نہ کرے۔ (طبرانی)

کیا گھر میں ہمیشہ خوشی کا ماحول ہی رہتا ہے؟ یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے کبھی کبھی ماحول کشیدہ بھی ہو جاتا ہے۔

مکمل راحت وسکون ایک خیالی چیز سے زیادہ نہیں۔

انسان تنہا رہے یا کسی دوسرے کے ساتھ ہمیشہ خوشی کے موڈ میں نہیں رہ پاتا۔

یہ سمجھداری کی بات ہے کہ دل کو بعض تلخیوں اور ناگوار چیزوں کو برداشت کرنے پر آمادہ کیا جائے، اور برے نتائج تک نہ پہنچنے دیا جائے۔

چونکہ اسلام کی نگاہ میں مرد گھر کا ذمّے دار ہوتا ہے اس لیے اسے صبر و برداشت سے کام لینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:
کہ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں انھیں سیدھا کرنے کے چکر میں کہیں توڑ ہی نہ بیٹھو۔ (یعنی طلاق تک نوبت نہ پہنچ جائے) اس لیے وہ جیسی ہیں اسی طرح ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔



یہ نفسیاتی طور پر ذلّت آمیز بات ہے کہ شوہر یا بیوی جیسی نعمت کی بے قدری کی جائے لوگ ـــــ مرد اور عورت دونوں ـــــ اکثر احسان بھول جاتے ہیں گویا کسی نعمت کی قدردانی اور نعمت والے کا احترام کوئی بہت بڑا بوجھ ہے۔

بے قدری سے دوسرے انسان کا دل بُجھ جاتا ہے۔

جو عورت اپنے شوہر کی بے قدری اور احسان ناشناسی پر اپنے طرزِ عمل کی بنیاد

رکھے وہ یقیناً اپنے لیے تباہی کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

"اللہ تعالیٰ اس عورت کی طرف نگاہ نہیں اٹھائے گا جو اپنے شوہر کی شکر گزار نہ ہو جبکہ اس سے بے نیاز بھی نہیں ہو سکتی۔" (حاکم)

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے:

"مجھے جہنّم دکھائی گئی تو اس میں اکثریت انکاری عورتوں کی تھی۔

عرض کیا گیا: کیا وہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتی تھیں؟

فرمایا: نہیں، احسان اور صاحبِ خاندان کی منکر تھیں۔ اگر تم ان میں سے کسی کے ساتھ ایک زمانے تک حسنِ سلوک کرو پھر وہ کبھی کوئی ناگوار چیز دیکھ لے تو کہہ دے گی کہ میں نے تم سے کبھی کوئی بھلائی نہیں دیکھی۔" (بخاری)

طلاق سے متعلّق غلطیاں

اشتعال کے زیر اثر کسی اقدام کے نتیجے میں خاندان کی تباہی سے معاشرے کو جو انتہائی نقصان پہنچتا ہے اس کے مضر اثرات اور ان تعلیمات کے باوجود جو اسلام نے خاندان کے استحکام کی اہمیت کے سلسلے میں واضح طور پر دی ہیں، مسلمان کچھ دنوں سے اس اہم معاملے میں اپنے دین کی رہنمائی کو دانستہ یا نادانستہ طور پر، نظر انداز کر کے اپنے آپ پر بہت بڑا ظلم کر رہے ہیں۔

انھوں نے جان بوجھ کر بعض احکام کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور بعض احکام کی صورت بگاڑنے کے لیے ذہنی مریضوں کو آزاد چھوڑ دیا ہے جس کے نتیجے میں المناک فقہی اور عملی انتشار پیدا ہو رہا ہے۔

مثلاً میاں بیوی کے اپنے باہمی مسائل کے حل کرنے میں ناکام ہو جانے کی صورت میں ثالثی کا مسئلہ لیجیے۔ لگتا ہے مسلمان اس حکم کو یکسر نظر انداز کر دینے پر متفق سے ہو گئے ہیں یا کسی ڈوبنے والے خاندان کو بچانے کی کوشش خال خال ہی نظر آتی ہے جبکہ الٰہی ہدایت بالکل واضح ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	اور اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں آپس میں ضد رکھتے ہیں تو ایک منصف مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورت والوں میں سے کھڑا کرو اگر وہ دونوں صلح کرانا چاہیں گے

عَلِيْمًا خَبِيْرًا۔ تو اللہ ان دونوں میں موافقت کر دے گا۔
(النساء۔ ۳۵) بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا خبر دار ہے۔

آخر اس سے انحراف کا راز کیا ہے، کیا صلح صفائی کرانے سے دلچسپی ہی ختم ہو گئی ہے؟ یا باپ کی زندگی ہی میں بچوں کو یتیم بنا دینے میں دلچسپی پیدا ہو گئی ہے؟

اللہ تعالیٰ کی ہدایات سے آنکھیں بند کر لینے کا یہ عجیب معاملہ ہے۔

اسلام میں طلاق ازدواجی تعلق کو روکنے سے شروع ہوتی ہے اسے منقطع کر دینے سے نہیں۔ جیسے کوئی ملازم اپنے کام کے ساتھ تعلق باقی رکھنے کے باوجود کسی معذوری کی وجہ سے عارضی طور پر کام پر نہ جائے۔

اسی لیے یہ لازم کیا گیا ہے کہ طلاق ہونے کے بعد بھی عورت شوہر کے گھر میں رہے ابھی وہ اس کا گھر برقرار ہے۔ مرد کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اسے گھر سے نکال دے۔

کیا مسلمان عملاً ایسا کرتے ہیں؟ کیا طلاق کا لفظ سننے کے بعد عورت گھر میں رہتی ہے؟

عام طور پر اس ہدایت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ کہ وہ لفظ سنتے ہی عورت گھر چھوڑ دیتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو کوئی حل نکلنے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

کیا اس طرح کا بچکانہ جذبہ اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت پر عمل ہے کہ:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ	اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان
فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا	کی عدت پر طلاق دو اور عدت کو گنتے رہو
الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوهُنَّ	اور اللہ سے جو تمہارا رب ہے ڈرو ان کو
مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا	ان کے گھروں سے مت نکالو اور وہ بھی
أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ	نہ نکلیں سوائے اس کے کہ جو صریح بے حیائی
وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ۔	کریں یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں۔

(الطلاق۔ ۱)

اسلام نے مطلقہ عورت کو ٹھہرنے کا حکم دیا ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ اس وقت

تک انتظار کیا جائے جب آندھی تھم جائے، ضمیر کی آواز جاگ جائے، دونوں فریق اپنے اپنے موقف پر نظر ثانی کریں، ماضی کی یادوں اور مستقبل کے نتائج پر غور کریں اور اگر بچے ہوں تو ان کے مستقبل پر نگاہ ڈالیں۔

طلاق کے بعد ہی گھر چھوڑ دینا مفاہمت کا موقع ضائع کر دینا اور حماقت پر عقل و دانش کو غالب آنے سے روک دینا ہے۔

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا

اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے بڑھے تو اس نے اپنا بُرا کیا۔ اس کو خبر نہیں شاید اللہ اس طلاق کے بعد نئی صورت پیدا کر دے۔

(الطلاق - ۱)

لیکن اس کے باوجود مسلمان اس بارے میں اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں۔

طلاق کوئی ایسا لفظ نہیں جسے جب چاہیں بول دیں اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک طریقہ مقرر فرمایا ہے۔

دوا صرف اسی سے فائدہ نہیں پہنچا سکتی کہ اس میں فائدہ پہنچانے والی چیزیں شامل ہیں۔ اس کو اس طرح استعمال کرنا بھی ضروری ہے جس طرح معالج بتلائے۔

جو معالج کے بتائے ہوئے طریقے کے بجائے خود اپنی مرضی سے کوئی دوا استعمال کرے وہ نقصان پہنچنے کی صورت میں خود اپنے آپ ہی کو ذمّے دار ٹھہرا سکتا ہے۔

طلاق کے لیے اسلام نے کچھ قائدے مقرر کیے ہیں۔

سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ طلاق ایسے طُہر میں دی جائے جس میں شوہر نے بیوی کو چھوا نہ ہو اگر اس نے طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو انتظار کرے کہ وہ حالتِ طُہر میں پہنچ جائے۔ پھر اس طُہر میں قریب نہ جائے پھر پورے شعور کی حالت میں وہ لفظ منھ سے نکالے یہ نہیں کہ جب چاہا طلاق دے ماری۔ اس طرح بیوی کو گھر میں رہنے میں بھی آسانی ہوگی۔

طَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوْا

ان کو ان کی عدّت پر طلاق دو اور عدّت کو

اَلْعِدَّةَ۔ (الطلاق۔ ۱) گنتے رہو۔

یہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مروی سنت ہے جسے عام مسلمان نظر انداز کر رہے ہیں بہت سے فقہاء مذکورہ صورت کے علاوہ اور کسی بھی طریقے سے دی گئی طلاق کو مسترد کرتے ہیں۔ مثلاً حالتِ حیض میں طلاق دینے کو نہیں مانتے، وہ حرام ہے اور واقع نہیں ہوگی۔

وَمَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا مَا لَیْسَ مِنْہُ جو ہمارے معاملے میں کوئی نیا طریقہ ایجاد کرے
فَہُوَ رَدٌّ۔ (مسلم) وہ مسترد ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ مسلمان صرف طلاقِ بدعت ہی سے واقف رہ گئے ہیں جبکہ عام فقہاء اسے تسلیم نہیں کرتے، اگر سارے فقہاء اسی پر اتفاق کر لیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔

طلاقِ بدعت کو مسترد کرنا اور اس کو پائے حقارت سے ٹھکرانا ہی ہمارے نزدیک حق اور مصلحت کے مطابق ہے۔

پھر طلاق بہت سی صورتوں میں بالکل ہی بے معنی انداز میں دی جانے لگی ہے۔ اسے قسم بنا لیا گیا بلکہ جاہل لوگ عام طور پر اسی کی قسم کھانے لگے (مثلاً میری بیوی کو طلاق ہے اگر یہ بات نہ مانی گئی، یا یہ بات جھوٹی نکلے یا فلاں مطالبہ پورا نہ ہوا وغیرہ وغیرہ) جب کہ یہ سب بالکل لغو ہے۔ قسم تو صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی کھائی جاسکتی ہے۔

اسی طرح نشے میں مدہوش اور پاگل پن کی حالت کے شکار لوگوں کی طلاق کا کیا وزن ہو سکتا ہے۔ وہ جو بولتے ہیں وہ ان کی نیت نہیں ہوتی، نہ وہ سمجھتے ہیں کہ کیا بول رہے ہیں۔

شادی کا بندھن پورے ہوش و حواس اور ارادہ و اختیار سے قائم ہوتا ہے اسی طرح اسے ختم بھی ہونا چاہیے۔



کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں طلاق کو پابند کرنا چاہتا ہوں کہ وہ قاضی کے سامنے

ہی دی جائے۔؟

نہیں، ہرگز نہیں۔

طلاق دینا شوہر کا حق ہے۔ دنیا بھر کی پولیس یہ صلاحیت نہیں رکھتی کہ وہ مرد کو کسی ایسی عورت کے ساتھ رہنے پر مجبور کر سکے جس سے وہ نفرت کرتا ہے اور قطعِ تعلق کا فیصلہ کر چکا ہے۔

اور اس طرح کا قانون خود عورت کے لیے بھی باعزت نہیں ہوگا۔

مغرب میں یہ صورت ہے کہ مرد رسمی طور پر شوہر باقی رہتا ہے اور دونوں تعلق کہیں اور قائم کر لیتے ہیں۔

طلاق کے غلط استعمال کا علاج یہ ہے کہ علمی و اخلاقی سطح بلند کی جائے۔ امت کو اس کے پہلے اجتماعی اصولوں کی طرف لوٹایا جائے جو انتہائی شریفانہ ہیں۔

تعددِ ازواج پر پابندی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔

قانون اس میں عقیدہ اور حسنِ اخلاق کے تقاضوں سے زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہو سکتا۔ کچھ لوگ یقیناً اس حق کا غلط استعمال کرتے ہیں لیکن اس مرض نے خاندان کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا ہے جتنا مغرب سے آئی ہوئی جنسی و اخلاقی انارکی اور انتشار نے خاندان کی بنیادوں کو ڈھانے میں کردار ادا کیا ہے۔

ایسے لوگوں کے منہ سے تعددِ ازواج پر پابندی کی بات کیا اچھی لگے گی جنھوں نے اپنی عمریں سیکڑوں عورتوں کے ساتھ گزاری ہیں۔

کچھ ناگزیر باتیں

مرد کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ تنگدلی کے احساسات کو آگے نہ بڑھنے دے اور اپنی بیوی کی جو باتیں اسے ناپسند ہوں انھیں میں ذہن کو نہ الجھائے رکھے بلکہ اس کے اچھے پہلوؤں پر توجہ دے۔ بیوی کی سیرت اور طرزِ سلوک میں اسے بہت سے خوشگوار پہلو بھی ضرور ملیں گے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے نفرت نہ کرے۔ اگر اس کی کوئی بات ناگوار ہوگی تو کوئی خوشگوار بھی ہوگی۔" (مسلم)

اگر مرد پر بدگمانی ہی غالب آجائے اور یہ سمجھنے لگے کہ وہ اس سے مکمل نفرت کرتا ہے تو اسے یہ جاننا چاہیے کہ بدگمانیاں اکثر غلط ثابت ہوتی ہیں اور کبھی کبھی مرد ہی بھلائی کی باتوں کو سمجھنے میں کوتاہی کرتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (النساء۔ ۱۹)	اور عورتوں کے ساتھ اچھی طرح گزر کرو پھر اگر وہ تمہیں نہ بھاویں تو شاید تم کو ایک چیز پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت خوبی رکھی ہو۔



کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اچھے سلوک اور دلنشیں نصیحت سے سدھر جاتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جنھیں نرمی کے بجائے کبھی سختی ہی سدھار پاتی ہے۔

عورت کو سدھارنے کے سلسلے میں سختی آخری علاج ہے اور اسے اسی وقت اختیار کیا جاسکتا ہے جب نرمی بے اثر ہو جائے اور وہ بالکل ہی سرکشی پر بضد ہو۔ لیکن سختی کی صورت میں بھی اسے چہرے پر مارنے یا اس کی شکل بگاڑ دینے تک جانے کی اجازت نہیں۔ ایک پُرسکون و ہم آہنگ خاندان کے سایہ میں اچھی عادتیں پروان چڑھتی ہیں۔ شریفانہ روایات مستحکم ہوتی ہیں اور ایسے افراد تیار ہوتے ہیں جو بڑی سے بڑی ذمّے داری اٹھاسکیں۔ اور ایسی عورتیں تیار ہوتی ہیں جو بہترین مثالی گھرانے تشکیل دے سکیں۔

اسلام اسی لیے خاندان کے حالات سے بہت دلچسپی لیتا ہے اور ایسی ہدایتوں کے ذریعہ خاندان کو پروان چڑھانے پر زور دیتا ہے جو ہر اعتبار سے بھلائی اور آسائش کے فروغ میں مدد دیں۔

قرآن و حدیث میں ایسی ہدایات بہت ہیں جن میں خاندان کے تمام افراد ــــ والد، والدہ، قریب اور دُور کے رشتہ داروں وغیرہ ــــ کے درمیان تعلقات کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ خاندان کی سلامتی ہی پورے معاشرے کے سکون و اطمینان کا واحد راستہ ہے۔

جس معاشرے میں خاندان کے روابط کمزور پڑ جائیں اس کا بھلا نہیں ہوسکتا اس نعمت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ۔ (النحل۔ ۷۲)	اور اللہ نے تمہارے لیے تمہاری قسم سے عورتیں پیدا کیں اور تمہیں تمہاری عورتوں سے بیٹے اور پوتے دیے اور تمہیں کھانے کو ستھری چیزیں دیں سو کیا جھوٹی باتیں مانتے ہیں اور اللہ کے فضل کو نہیں مانتے۔

میاں بیوی کے درمیان باہمی تعلقات اور والدین کی گود میں بچوں اور بچیوں کی پرورش صرف انھیں کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ قوم کے حال و مستقبل کی نمائندگی کرتی ہے۔

اسی لیے جب شیطان کسی خاندان کا شیرازہ منتشر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے تو وہ محض ایک گھر کو مسمار نہیں کرتا اور ایک محدود برائی پیدا نہیں کرتا بلکہ پوری قوم کے لیے ایک دوررس برائی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

کسی خاندان کی بربادی سے شیطان کی آنکھیں کس طرح ٹھنڈی ہوتی ہیں اس کا اندازہ آپ اس حدیث سے کر سکتے ہیں:

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ابلیس پانی کے اوپر اپنا تخت بچھاتا ہے پھر اپنے لشکر ادھر ادھر بھیجتا ہے ان میں سے ابلیس کے سب سے زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جو سب سے بڑا فتنہ پیدا کرے۔

ایک آتا ہے اور کہتا ہے: میں نے فلاں فلاں کام کیا۔

ابلیس کہتا ہے: تم نے کچھ نہیں کیا؛

پھر ایک آکر کہتا ہے: میں نے فلاں شخص کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان ایسی پھوٹ نہیں ڈال دی جس سے وہ پھر قریب نہ ہو سکیں۔

ابلیس کہتا ہے: ہاں تم نے کارنامہ انجام دیا۔ اور اسے چمٹا لیتا ہے۔" (مسلم)

فرد اور قوم کے تعلّقات

قوم ایک بڑا خاندان ہے جس سے آدمی انتساب رکھتا ہے، اس کے پیغام کی علمبرداری میں شریک ہوتا ہے، اس کے میدان میں سرگرمیاں دکھاتا ہے، اس کے جھنڈے تلے جدّوجہد کرتا ہے اور اس کی فتح یابی سے شادکام اور اس کی ہزیمت سے شکستہ دل ہوتا ہے۔

بڑے دل اور کردار کا آدمی اپنی قوم کے تعلق سے اس سے زیادہ دلچسپی و اہتمام رکھتا ہے جو اسے خود اپنی ذات کے تعلق سے ہوتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ بہترین معاملہ کرتا ہے اور ہر ایسی چیز کے لیے کوشاں رہتا ہے جس سے اس کا تعلق اہلِ قوم سے مضبوط و مستحکم ہو۔

امّتِ اسلامیہ اپنے پہلے دَور میں باہمی الفت و محبّت کا مثالی نمونہ تھی حکمراں اور عام شہریوں کے مابین تعلقات محبّت و عزت پر مبنی تھے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"تمہارے بہترین ائمہ (حکمران) وہ ہیں جن سے تم بھی محبت کرتے ہو اور جو تم سے بھی محبّت کرتے ہیں اور جن کے لیے تم بھی دُعا کرتے ہو اور جو تمہارے لیے بھی دُعا کرتے ہیں۔" (منذری)

اور یہ بات تبھی ہو سکتی ہے جب دلوں میں صفائی ہو، انصاف کا بول بالا ہو اور وہ عام پیغام کامیاب ہو جس کی علمبرداری میں حکمراں اور عوام ایک دوسرے سے

تعاون کریں۔

اس باہمی محبت اور اس جامع پیغام کی عظمت کا اندازہ آپ ان احساسات سے کرسکتے ہیں جو دشمن سے مقابلے کے وقت مجاہدین کے دلوں میں ہوا کرتے تھے۔

حضرت نعمانؓ بن مقرن ایران کے محاذ پر نمایاں کمانڈروں میں سے تھے جنگ کے دوران ان کے جذبات محاذ سے دُور عام اہلِ ایمان کے جذبات سے کس طرح مربوط ہوتے تھے فرماتے ہیں کہ:

"میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ متعدد غزوات میں حصّہ لیا جب فجر طلوع ہوتی تھی تو آپ جنگ سے رُک جاتے تھے یہاں تک کہ سورج طلوع ہوجائے۔ پھر سورج طلوع ہونے کے بعد جنگ فرماتے تھے یہاں تک کہ جب دوپہر ہوجاتی تو رک جاتے، سورج ڈھل جاتا تو پھر عصر تک جنگ فرماتے تھے پھر رک کر نمازِ عصر فرماتے پھر جنگ فرماتے۔ آپؐ فرماتے تھے کہ ان اوقات میں مدد اور نصرت کی ہوائیں چلتی ہیں اہلِ ایمان اپنی نمازوں میں اپنے لشکروں کے لیے دُعا کرتے ہیں۔" (ترمذی)

اسلام اہلِ ایمان کے درمیان یہی مضبوط اخوت پیدا کرتا ہے اور اس کے بنیادی عناصر یہ ہوتے ہیں:

خالصۃً اللہ کے لیے اخوت۔

جسے ایمان کے مختلف شعبوں سے غذا ملتی ہے۔

جسے دعوت کے مقاصد باہم مربوط و مضبوط کرتے ہیں۔

کشادگی و تنگی دونوں صورتوں میں اللہ کے لیے جدّوجہد کے مراحل جس کی نشوونما کرتے ہیں۔

یہی اخوت اسلام کی رُوح ہے اس کے نظام کا لب لباب اور اس کی اجتماعیت و حکومت کی بنیاد ہوتی ہے۔

اور جس بنیاد پر اسلامی معاشرے کی عمارت کھڑی ہو اسے صرف اللہ ہی کے لیے

ہونا بھی چاہیے۔ یہ اخوت کوئی خالی خولی نعرہ نہیں۔

یہ تو اسلامی تعلیمات کے ساتھ وفاداری، اس کی ہدایات کو نافذ کرنے اور پھیلانے کی روحانی ومادی شرکت کا نام ہے چاہے اس میں جو بھی مشکل اور پریشانی اٹھانی پڑے اور چاہے اس کی راہ میں کیسی ہی مسرت انگیز یا المناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بہت سی حدیثوں میں دینی مقاصد کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ ہی کے لیے اخوت قائم کرنے پر زور دیا گیا ہے کیوں کہ تبھی یہ امت اپنے مفوضہ پیغام کی مخلص اور اس کے لیے کوشاں ہو سکتی ہے۔

حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تین باتیں جس میں بھی ہوں گی وہ ایمان کا مزا اور حلاوت پائے گا۔

یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک باقی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں۔

یہ کہ وہ اللہ ہی کے لیے محبت کرے اور اسی کے لیے نفرت کرے۔

اور یہ کہ آگ کا بڑا الاؤ دہکایا جائے اور پھر وہ اس میں گر پڑے۔ یہ اسے اس سے زیادہ پسند ہو کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائے۔" (بخاری)

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سایہ میں رکھے گا جب اس کے سوا کوئی اور سایہ نہیں ہوگا:

امامِ عادل، وہ نوجوان جس کی اٹھان ہی اللہ کی عبادت میں ہوئی ہو، وہ آدمی جس کا دل مسجد ہی سے معلق رہتا ہو، ایسے دو شخص جنھوں نے اللہ کے لیے محبت کی اسی کے لیے اکٹھا ہوئے اور اسی کے لیے جدا ہو گئے، وہ آدمی جسے کسی منصب اور حسن والی عورت نے بلایا ہو اور اس نے یہ کہہ کر (انکار کر) دیا ہو کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں، وہ آدمی جس نے کوئی صدقہ کیا ہو اور اسے اس طرح چھپایا ہو کہ اس کا بایاں ہاتھ بھی نہ جان سکے کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا، اور وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد

کیا ہو اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ہوں۔" (بخاری)

حضرت ابودرداءؓ کی روایت میں ہے:

"دو آدمی جب غائبانہ طور پر اللہ کے لیے باہم محبت رکھتے ہیں تو ان میں سے جو اپنے ساتھی سے زیادہ شدید محبت رکھتا ہے وہ اللہ کو زیادہ پسند ہوتا ہے۔"

حضرت ابوادریس خولانیؒ کی روایت ہے کہ میں دمشق کی مسجد میں گیا تو دیکھا ایک چمکیلے دانتوں والے شخص موجود ہیں اور کچھ لوگ ان کے ساتھ ہیں جب کسی چیز میں اختلاف رائے ہوتا ہے تو ان سے رجوع کرتے ہیں اور ان کی بات مان لیتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا حضرت معاذ بن جبلؓ ہیں۔

دوسرے دن میں دوپہر میں پہنچا تو وہ پہلے ہی سے پہنچ چکے تھے اور نماز پڑھ رہے تھے میں انتظار کرتا رہا جب وہ نماز پوری کر چکے تو میں سامنے سے آیا، سلام کیا اور عرض کیا:

میں آپ سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں، انھوں نے فرمایا کیا (واقعی) اللہ کے لیے؟

میں نے عرض کیا (ہاں) اللہ کے لیے، تو انھوں نے میری چادر کا کونا پکڑا اور فرمایا: تمہیں خوشخبری ہو۔ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"میری محبت واجب ہو گئی ان لوگوں کے لیے جو میرے لیے باہم محبت کرتے ہیں، میرے لیے باہم مل بیٹھتے ہیں، میرے لیے ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اور میرے لیے باہم خرچ کرتے ہیں۔" (مالک)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں تین باتوں پر قسم کھاتا ہوں:

جس کا اسلام میں کوئی حصہ ہو اسے اللہ اس شخص جیسا نہیں بناتا جس کا کوئی حصہ نہ ہو۔ اور اسلام کے حصے تین ہیں: نماز، روزہ اور زکاۃ۔

اور اللہ تعالیٰ دنیا میں کسی شخص کو دوست بناتا ہے تو قیامت کے دن اسے کسی دوسرے کے سپرد نہیں کرتا۔

اور جو شخص کسی قوم کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے انھیں کے ساتھ کر دیتا ہے۔" (احمد)



اسلامی اخوت دو بنیادوں پر قائم ہے:

ایک مقدس پیغام جو پروردگارِ عالم کی طرف سے نازل ہوا۔

ہر میدان میں اس پیغام کے لیے جدّ و جہد کے سلسلے میں باہم تعاون کرنیوالی امت۔ اس اخوت کے زبردست مثبت اثرات ہوتے ہیں۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا امتِ اسلامیہ میں فرد ریاست میں فنا و ضم ہو جاتا ہے؟ اس کی اپنی کوئی انفرادی حیثیت برقرار نہیں رہ جاتی ہے جیسا کہ کمیونسٹ ممالک میں ہوتا ہے؟ یا ریاست فرد کی خادم بن کر رہ جاتی ہے جیسا کہ جمہوری ممالک کا حال ہے؟

اسلام ایک آسمانی شریعت کا نام ہے جس کا مقابلہ زمینی نظریات سے نہیں کیا جاسکتا پھر بھی ہم چاہیں گے کہ فطرت کی امتیازی خصوصیات کا ذکر کر دیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کے لیے بھلائی کی کتنی ضمانت دی گئی ہے۔

اسلام نے انسان کو انتہائی عزت بخشی ہے بلکہ اسے ناز برداری تک پہنچا دیا ہے۔

اسے اس وسیع عالم کا مالک بنایا ہے اور اس کے ہاتھ میں اس کے خزانوں کی کنجی دے دی ہے۔

اسے عقل و دانش کی قیمت و اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے یہ ہدایت بھی کر دی ہے کہ فکر و نظر کے دریاؤں میں ہاتھ پیر مارو لیکن اس سے چوکنا رہو کہ کہیں ڈوب نہ جاؤ۔

اس نے آسمان و زمین کی چیزوں پر غور کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام خواہشِ نفس، سرکشی اور جرم کی آزادی نہیں دیتا لیکن یہ آزادی کو پابند کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی حدود قائم کرنا ہے تاکہ تمام انسان آزادی میں اپنا حصہ پا سکیں۔ کسی مخلوق کی آزادی اس لیے کم نہ ہو کہ دوسری مخلوق نے اپنے حق سے زیادہ آزادی غصب کرلی ہے۔

انسان کی ناز برداری کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ جنگ اور مستقبل سے تعلق رکھنے والے معاملات میں، جہاں ریاست فرد کی آزادی کا حق ضبط کرلیتی ہے اسلام انسان کی عزت کو برقرار رکھتا ہے۔

حضرت حذیفہؓ بن الیمان کی روایت ہے کہ مجھے غزوۂ بدر میں شرکت کرنے سے صرف اس بات نے روک دیا کہ میں ابوجہل کے ساتھ نکلا تو کفارِ قریش نے ہمیں پکڑ لیا۔

انھوں نے کہا: تم لوگ محمدؐ سے ملنے جارہے ہو۔؟

ہم نے کہا: نہیں ہم صرف مدینہ جانا چاہتے ہیں۔

تب انھوں نے یہ عہد و پیمان لے کر ہمیں چھوڑا کہ ہم مدینہ چلے جائیں گے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔

ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو یہ بات آپؐ کو بتائی۔

آپؐ نے فرمایا: تم دونوں لوٹ جاؤ۔ ہم ان کے ساتھ کیا گیا عہد و پیمان پورا کریں گے اور ان کے خلاف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگیں گے"۔ (مسلم)

کیسی حیرت ناک بات ہے؟؟ ایک عام مسلمان ایک بات کہتا ہے اور ریاست اسے شرمندہ نہیں ہونے دیتی بلکہ اس کی عزت و احترام کی حفاظت کرتی ہے۔

اور یہ اس صورت حال میں ہے جب معرکۂ بدر میں مسلمانوں کی تعداد اپنے دشمن کے مقابلے میں صرف ایک تہائی ہے اور ایک ایک فرد کی انتہائی اہمیت ہے۔ تب بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دونوں کو اپنے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لینے دیتے اور لوٹا دیتے ہیں۔

پھر عہد کی اس پابندی کو ذاتی مسلک نہیں بناتے بلکہ اسے ریاست کا کردار بنا دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہم اس عہد کو پورا کریں گے۔

دنیا بھر کے کسی فرد کو کسی بھی جمہوری نظام میں یہ عزت کبھی حاصل ہوئی ہے؟

حضرت حذیفہ رضؓ ہی کی طرح ایک عورت کے ساتھ بھی معاملہ پیش آتا ہے۔

حضرت اُمّ ہانی رضؓ بنت ابوطالب معرکہ بدر کے بعد دو مشرکین کو اپنے یہاں پناہ دے دیتی ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اُم ہانی اتم نے جنھیں پناہ دی ہے ہم نے بھی انھیں پناہ دے دی۔

فتوحات کے دوران کسی معرکہ میں ایک مسلمان غلام نے محصور مشرکین کو امان کی پیش کش کر دی اور انھوں نے اسے قبول کر لیا۔ ایک غلام کے اس اقدام پر مسلمانوں میں اختلاف رائے پیدا ہوا۔ حضرت عمر رضؓ کے کانوں تک بات پہنچی تو آپ نے اس امان کو برقرار رکھنے کا حکم دیا اور اس طرح غلام کی بات کا احترام کیا۔

ایک ادنیٰ مسلمان کی ذمّے داری کا پاس بھی مسلمان کیا کرتے تھے۔



اسلام نے جہاں فرد کو یہ باعزت آزادی دی ہے وہیں اس کی ظالمانہ خواہشات کو حدود میں رکھنے کی کوشش بھی کی ہے تاکہ یہ آزادی سرکشی و اسراف تک نہ پہنچ جائے۔

فرد کو اس پیغام کے مقاصد کے تابع بنایا گیا ہے جس پر معاشرے کی بنیاد ہے اور جس کے نظام کو نافذ کرنا ریاست کی ذمّے داری ہے۔

فرد اس طرح ریاست میں ہضم نہیں ہو جاتا جیسے ریاست کوئی نیابت ہو اور رعایا کی حیثیت اس کے جانثار پجاریوں کی ہو۔

اسلام میں ریاست کی حیثیت اسلام اور اس کے اعلیٰ انسانی مقاصد کے محافظ کی ہوتی ہے انھیں مقاصد کے لیے وہ ہر فرد سے جان و مال کی قربانی طلب کرتی ہے۔

اور اس سچے جذبے کی بدولت اسے ہر میدان میں رہنمائی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص اپنے کو اتنا با اختیار قرار دے کہ دوسرے لوگوں کو اپنے اشاروں پر نچانے لگے۔

اسلام میں جو حکومتی ڈھانچہ پایا جاتا ہے اس کا کام اللہ تعالیٰ کے احکام کی سربلندی کے لیے لوگوں کی رہنمائی ہے۔

اور اس ڈھانچے کا یہ حق ہوتا ہے کہ اس کے حکم کی اطاعت کی جائے اور اس کی رہنمائی کو قبول کیا جائے۔ یعنی فرد اپنی ذمے داری کی ادائیگی کا مکلف ہوتا ہے اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ۔ (التوبہ۔ ۱۱۱)	اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال خرید لیا اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں پھر مارتے ہیں اور مرتے ہیں۔
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ (النور۔ ۶۲)	اہلِ ایمان وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر یقین لائے اور جب اس کے ساتھ ہوتے ہیں کسی جمع ہونے والے کام میں تو جب تک اس سے اجازت نہ لے لیں چلے نہیں جاتے۔
اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ (النور۔ ۵۱)	ایمان والوں کی بات تو یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور رسول کی طرف ان میں فیصلہ کرنے کو بلایا جائے تو کہیں کہ ہم نے سُن لیا اور مان لیا۔

اس کا مفہوم ریاست میں فرد کا گم ہو جانا اس کی اپنی شخصیت اور اس کی صلاحیتوں کی نفی نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو کسی بھی انسان کا حقیقی و لازمی موقف ہونا چاہیے۔ ایسی حالت میں ریاست کے سامنے فرد کی خود سپردگی اللہ کی اطاعت اس کی

خوشنودی کے حصول اور روئے زمین پر اس کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کا حصہ ہے۔

آج کے بعض معاشی نظام جس طرح فرد کی شخصیت اور اس کی ذاتی آزادی کو سلب کرتے ہیں اس سے دل میں خوف و دہشت اور نفرت کی فضا پیدا ہوتی ہے اس میں شریفانہ شوق و تحریک کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

اسلام اس طرح کی صورتِ حال تسلیم نہیں کرتا وہ عمل کو بدنیتی سے پاک کرتا ہے اور اسے خالصتاً اللہ کے لیے بناتا ہے۔ وہ کسی بھی انسان کی رضا جوئی کے لیے عمل کو مسترد کر دیتا ہے۔

اسلام کسی بھی شخص کو ایسا حاکم تسلیم نہیں کرتا جو عوام و خواص کو تسخیر کرنے کا بذاتِ خود رجحان رکھتا ہو یا مخلوق پر اپنی مرضی مسلط کرے کیونکہ اس طرح کی حاکمیت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے کسی انسان کے لیے نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے حاکم کو مشورہ لینے اور لوگوں کو اسے مشورہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

اگر حاکم غلطی کرتا ہے تو قوم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اس کی اصلاح کرے۔

حاکم و محکوم دونوں ہی جامع عقائد و احکام کے تابع ہیں ان سے تجاوز نہیں کر سکتے۔

اسلام ریاست اور فرد دونوں کو اتنا ہی اختیار دیتا ہے جس سے فرد کی انسانی عزت اور ذاتی خصوصیات کے تحفظ میں خلل نہ پڑے اور آسمانی پیغام اور حق کا جھنڈا سربلند ہو۔

حدود (سزائیں)

کیا اسلام نے ہر غلطی کے لیے فوری سزا کی ہدایت کی ہے؟
نہیں۔ لوگ کتنی ہی غلطیاں کرتے ہیں جن پر صرف نصیحت و تلقین یا ڈانٹ پھٹکار سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاتا۔
کفر کی مثال لیجیے جو سب سے بڑی اور سنگین غلطی ہے۔
اسلام نے اس کی کوئی سزا مقرر نہیں کی۔ بلکہ کافر کو صرف ایک غلط کار شخص قرار دیا جب تک وہ کسی جارحیت یا ایذا رسانی کا ذریعہ نہیں بنتا، وہ مسلمانوں کے ساتھ پورے حقوق اور ضمانتوں کے ساتھ رہے گا۔
والدین کی نافرمانی اور سود خوری جیسی بہت سی غلطیاں ہیں جنھیں اسلام شدید جرم مانتا ہے لیکن ان کی کوئی خاص سزا مقرر نہیں کی۔
صرف قتل، زنا، چوری، بے گناہ عورتوں پر تہمت لگانا اور نشہ ہی ایسے جرائم ہیں جن کے لیے اسلام نے سزائیں مقرر کی ہیں اور ان کی روک تھام اور ان کے مرتکبین کی سزا کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے۔
آج جب ہم جان و مال اور عزت و آبرو کے لٹیرے بھیڑیوں کے ہاتھوں لگنے والے زخموں سے کراہ رہے ہیں۔ ان الٰہی احکام کے نفاذ سے قائم ہونے والے انصاف کی اہمیت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔
لیکن ایسا لگتا ہے کہ بیشتر لوگ یہ نہیں جانتے کہ سزائیں (حدود) کب دی جاتی

ہیں اور مجرموں کی گردن کب پکڑی جاتی ہے۔

اگر وہ حقیقت سمجھ جائیں تو ان کا دل حکمِ الٰہی پر مطمئن ہو جائے اور وہ جان جائیں کہ وہ انصاف کا تقاضا بھی ہے اور رحمت کا بھی۔

انسان طبعی طور پر خطا کار ہے اور اس کی غلطیوں کا نقصان اس کی ذات کے علاوہ معاشرے کو بھی پہنچتا ہے۔

جہاں تک خطا کار کی اپنی ذات کا تعلق ہے اسے توبہ کرنے اور زیادہ بہتر طرزِ عمل اختیار کرنے کا موقع ملنا چاہیے اور جہاں تک معاشرے کا تعلّق ہے یہ اس کا حق ہے کہ اندھے پن کے رجحانات سے اس کے وجود کی حفاظت کی جائے اور معاشرے کے بے گناہ و معصوم لوگوں کو نقصان سے تحفظ فراہم کیا جائے۔

اسلام دونوں پہلوؤں کا لحاظ کرتا ہے کسی ایک پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔

خطا کار کو اپنی خطا سے رجوع اور تلافی کے لیے جتنی آسانی اسلام فراہم کرتا ہے اتنی کوئی اور دین یا نظام فراہم نہیں کرتا۔

لیکن اگر کوئی شخص پاگل کتا بن جائے تو اسے آزاد چھوڑنا معاشرے کے لیے نقصان دہ ہوگا اور اسے سزا دینے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں رہ جائے گا۔

مسلمان اس پر متفق ہیں کہ کتاب و سنّت سے جو سات سزائیں ثابت ہیں ان کا نفاذ لازم ہے۔

چوری اور ڈکیتی

معاشرہ میں امن وامان کا بول بالا بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ کتنی خوش بختی کی بات ہے کہ انسان جان و مال اور آبرو کے تعلق سے کسی طرح کی تشویش اور اندیشہ کے بغیر جہاں چاہے آئے جائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب مکہ مکرمہ میں آبادی کی بنیاد ڈالتے ہوئے پروردگار سے دُعا کی تھی تو اس میں دو چیزیں طلب کی تھیں رزق کی ضمانت اور مستحکم امن اور امن کو رزق پر ترجیح دی ہے۔

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ۔ (البقرۃ - ۱۲۶)

اے میرے رب اس شہر کو امن کا شہر بنادے اور اس کے باشندوں کو ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔

امن وامان کا بول بالا ہو اور ہر انسان اطمینان سے رہ سکے اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سے احکام دیے ہیں۔ ایک اہم حکم چوری کی سزا کا ہے۔ بلاشبہ چوری ایک ایسا سنگین جرم ہے جس کا استیصال کیا جانا چاہیے، اس کا وجود ہی پریشان کن ہے چہ جائیکہ وہ عام ہوجائے۔

آپ اس مزدور کا تصوّر کیجیے جو اپنے بال بچّوں کے لیے پورے مہینے کھٹتا ہے پھر مہینے کے آخری دن بڑے شوق سے اپنی تنخواہ لے کر گھر لوٹتا ہے اور راستے بھر سوچتا جاتا ہے کہ کون کون سی ضرورت کس کس طرح پوری کی جائے۔ اچانک کوئی اُچکا راستے میں اس کی پوری تنخواہ اُچک لیتا ہے۔ اب وہ کیا کرے اور کیا کہے؟

اس چور کو کیسے آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ لوگوں کی اتنی مشقت کی کمائی کو ہڑپ کرتا رہے۔

میں ایک ایسے ملازم کو جانتا ہوں جو دو سال کے لیے ملک سے باہر چلا گیا کہ کچھ کما کر اپنا گھر بنا سکے پھر اس میں اپنی بیوی کے ساتھ آرام سے رہ سکے اچانک ایک دن نقب زنوں نے گھر میں نقب لگا کر سارا سامان لوٹ لیا۔

ایک کسان نے بڑی جانفشانی سے فصل تیار کی لیکن اسے بیچنے کے بعد گھر لوٹتے ہوئے چوروں نے سارا روپیہ چھین لیا۔

اس طرح کام نہ کرنے والے خبیث مشقت سے کمانے والوں کی کمائی ہڑپ کر جاتے ہیں پھر یہ کمینے لوگ لوٹی ہوئی دولت کو بے دریغ خرچ کرکے عیش لوٹتے ہیں۔ انھوں نے کوئی مشقت تو جھیلی نہیں ہوتی کہ انھیں خرچ کرنے میں کچھ سوچنا پڑے۔

بلاشبہ معاشرے پر لازم ہے کہ اس طرح کے لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرے اور انھیں ایسی سزا دے کہ خود وہ بھی آئندہ ایسا نہ کر سکیں اور دور و نزدیک کے دوسرے لوگ بھی ڈر جائیں۔

اسلام کی نگاہ میں ہاتھ تین طرح کے ہی ہوتے ہیں:

ایک وہ ہاتھ جو کام کرتا ہے۔ اس کا حق ہے کہ اسے تحفظ فراہم کیا جائے، اس کی حوصلہ افزائی کی جائے، اس کی راہ میں درپیش مشکلات کا ازالہ کیا جائے اور پورا اطمینان مہیا کیا جائے۔

ایک ہاتھ بیکار ہوتا ہے۔ اس کا حق ہے کہ اسے کام فراہم کیا جائے تاکہ وہ باعزت زندگی گزار سکے اور زندگی میں اپنا فطری حق حاصل کر سکے۔ اسے بھیک مانگنے یا چوری کرنے پر مجبور کرنا درست نہیں۔

تیسرا ہاتھ بگڑا ہوا ہاتھ ہوتا ہے جو باعزت کام نہیں کرنا چاہتا بلکہ لوگوں کو تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔ حلال و حرام اور خوب و ناخوب جاننے کے باوجود سدھرتا نہیں۔ اسلام اس ہاتھ کو کیا کرے سوائے اس کے کہ اسے کاٹ دینے کی ہدایت دے تاکہ اس ہاتھ والے کو اور ساتھ ہی پورے معاشرے کو راحت مل جائے۔

جو لوگ اس ہاتھ کو باقی رکھنے کے حامی ہیں ہم ان سے پوچھیں گے کہ آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟ اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ کچھ دن کے لیے جیل میں رکھ کر چھوڑ دیا جائے تو ہم دریافت کریں گے کہ اگر وہ جیل سے نکل کر پھر وہی کرنے لگے تب کیا ہوگا؟

اس طرح کی بات کوئی مخلص اور غیرت مند آدمی نہیں کہہ سکتا۔

سزا کے نفاذ میں جلد بازی کا مسئلہ دوسرا ہے اس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں سزا تو دینی اعتبار سے اسی وقت نافذ کی جا سکتی ہے جب قاضی کا دل بالکل مطمئن ہو جائے کہ مجرم سخت بھوک کا شکار ہونے کی حالت میں یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے وہ جرم نہیں کر بیٹھا تھا۔

ہاتھ تو وہی کاٹا جائے گا جو معاشرے پر ظلم کر رہا ہو نہ کہ وہ ہاتھ جس پر خود معاشرے نے ظلم کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ فَمَن تَابَ مِن بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ۔ (المائدۃ۔ ۳۸ - ۳۹)	اور چور خواہ مرد ہو یا عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کرلے تو اللہ کی نظرِ عنایت پھر اس پر مائل ہو جائے گی۔

جن ملکوں میں چور کا ہاتھ کاٹنے کی سزا نافذ ہوئی وہاں چوری تقریباً معدوم ہو گئی ایک ہاتھ کے کاٹنے سے بہت سے ایسے جیل خانے کھولنے کی ضرورت ختم ہوئی جہاں رہ کر مجرم اور سخت مجرم بن کر نکلا کرتے تھے۔

دوسرے کا مال ہڑپ کرنا ایسا جرم ہے جو وہیں تک بس نہیں کرتا بلکہ خون ریزی تک پہنچا دیتا ہے چوری کرتے وقت چور کے راستے میں جو شخص بھی حائل ہوگا وہ اسے مار ڈالنے کی کوشش کر سکتا ہے چاہے وہ سامان کا مالک ہو یا چوکیدار و محافظ۔

پھر ایک چور اپنے مقصد کے حصول کے لیے دوسرے چور کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ اس طرح چوروں، ڈاکوؤں اور رہزنوں کے گروہ بن جاتے ہیں جو باقاعدہ منصوبے بنا کر لوٹ مار کرتے ہیں اور آپس میں کام تقسیم کر لیتے ہیں جیل خانے اکثر اس طرح کے منصوبوں کی تیاری میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

مسلح ڈاکو، ریل گاڑیوں پر، بسوں اور کاروں پر، دکانوں اور کارخانوں پر یہاں تک کہ کھیتوں اور کھلیانوں پر حملے کرنے لگتے ہیں۔

پھر تعجب اس پر ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ان سے ہمدردی جتانے لگتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کی سزا میں تخفیف ہو جائے۔

اس طرح کے لوگوں کے ضمیر کے بارے میں مجھے زبردست شک ہوتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ چور سے ہمدردی تو چور ہی کر سکتا ہے اور قاتل کے لیے دردمندی قاتل ہی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔

اسلام تو فیصلہ کن انداز میں کہتا ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

(المائدۃ۔ ۳۳۔ ۳۴)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا جلاوطن کر دیے جائیں یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے اس سے بڑی سزا ہے مگر جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

یہاں تین باتوں کا لحاظ ناگزیر ہے:

۱۔ لوگوں کے مال کا تحفظ ضروری ہے۔ بے کار بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف سے غلط طریقوں سے مال حاصل کرنے کی خواہش کا سدِّباب بھی ضروری ہے اور آسمانی سزائیں اس کی بہت بڑی ضمانت ہیں۔

۲۔ جو لوگ انتشار پھیلاتے ہیں اور حقوق کو پامال کرتے ہیں ان کے لیے رحم کی گنجائش نہیں، انھیں چھوڑ دینا پورے معاشرے کے لیے مصیبتوں کا دروازہ کھول دینا ظلم کو شہ دینا اور اقدار کو پامال کرنا ہے۔

۳۔ اگر غلطی عارضی طور پر ہو جائے تو شریعت درگزر کرنے اور توبہ و رجوع کو آسان بنانے کی اولین حامی ہے کیونکہ اس کا اصول ہے کہ "امام معاف کرنے میں غلطی کر جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ سزا دینے میں غلطی کر جائے۔"

لیکن سزاؤں کو معطل کر دینے اور ان کے نفاذ میں باریک بینی سے کام لینے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کچھ لوگ یہ غلط بیانی کرتے ہیں کہ ہاتھ کاٹنے سے لوگ کام کرنے سے معذور ہو جائیں گے لیکن یہ مضحکہ خیز دلیل ہے چودہ سو برسوں کے دوران اس سزا سے فائدہ ہی پہنچا ہے نقصان نہیں۔ معاشرے میں شاذ و نادر ہی اس کی نوبت آتی ہے کیونکہ ہاتھ کاٹنے کی دہشت چوروں کو چوری سے باز رہنے اور جائز طریقوں سے روزی کمانے پر آمادہ کرتی ہے۔

زنا اور تہمت

اسلامی معاشرہ ـــــ جہاں تک جنسی پہلو کا تعلق ہے ـــــ کمیونسٹ اور سرمایہ پرست معاشروں کے بالکل برعکس ہے۔

ان معاشروں میں جنسی اتصال جسم کا تقاضا ہے۔ اخلاق و کردار، رُوحانیت اور ایمان و عبادت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

لیکن ہم مسلمان جنسی تعلقات کو دینی تعلیمات سے جوڑتے ہیں۔ اور پاکیزگی اور عفت کے دائرے میں محدود رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ۔ (المومنون ۵-۷)

اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی عورتوں یا اپنی باندیوں سے سو ان پر کچھ الزام نہیں پھر جو کوئی اس کے سوا ڈھونڈے وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔

جنسی خواہش کی تسکین کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق عقدِ شرعی۔ اب صرف اسی صورت میں ازدواجی تعلق ہو سکتا ہے۔

گھر کے اندر عورت زیب و زینت اختیار کر سکتی ہے لیکن گھر کے باہر جذبات کو مشتعل کرنا اور لذت پرستی کی جو صورتیں اباحیت پسندوں نے ایجاد کر رکھی ہیں اور مردوں اور عورتوں کو جس فتنہ انگیز راستے پر ڈال رکھا ہے وہ قابلِ ملامت ہیں جیسے آزادانہ اختلاط، مرد عورت کا باہمی رقص، فحش ڈرامے اور جانوروں کی طرح جنسی ملاپ جس کا

اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا کہ مشتعل جذبات کی آگ کسی بھی طرح ٹھنڈی کی جائے۔

اسلامی معاشرہ اس کے بالکل مخالف ہے۔ وہ زنا اور اس کی طرف لے جانے والی تمام چیزوں کو ناپسند کرتا ہے اس نے زانیوں کے لیے سخت سزائیں مقرر کر رکھی ہیں (غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑے اور شادی شدہ کے لیے سنگسار کرنا) بلاشبہ یہ سزائیں سخت ہیں لیکن منصفانہ ہیں۔

پھر ان سزاؤں کے نفاذ کے سلسلے میں اسلام نے انتہائی احتیاط سے کام لینا لازم قرار دیا ہے۔ ایسے چار گواہوں کا ہونا ضروری ہے جنھوں نے بچشم خود دیکھا ہو جبکہ یہ جرم عام طور پر چھپ کر کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں چار گواہوں کا پایا جانا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ گواہی کی بنیاد پر اس سزا کا نفاذ اتنا کم ہوا ہے کہ بعض لوگ تو اسے محض ڈرانے کے لیے سمجھتے ہیں۔

بلاشبہ اسلام نے زنا کا جرم ثابت کرنے میں بہت سخت احتیاط لازمی قرار دی ہے کیونکہ اس کے بہت سخت اور وسیع معاشرتی نتائج نکلتے ہیں۔ زنا کا اثر دو خاندانوں پر ایک ساتھ پڑتا ہے اور دونوں خاندانوں کو معنوی اور مادی تکلیفیں پہنچتی ہیں۔

ہاں امریکہ، یورپ اور ان کے مقلد ممالک میں ماحول اتنا گندا ہو چکا ہے اور لوگ اتنے گر چکے ہیں کہ جانوروں کی طرح باغوں میں اور سڑکوں تک پر زنا کرنے میں نہیں شرماتے۔ وہاں اس طرح کا جرم گواہی کی بنیاد پر ثابت ہونا آسان ہے۔

اسلام یقینی طور پر معاشرے میں پاکیزگی کا ماحول پیدا کرنے میں سزا پر انحصار نہیں کرتا بلکہ دلوں میں ایمان پیدا کرنے اور ضمیر کی اس طرح تربیت کرنے پر انحصار کرتا ہے جس سے اللہ کا ڈر پیدا ہو اور موقع ملنے کے باوجود اس طرح کے گناہ کا ارتکاب نہ ہو۔

پھر اسلام نے اس کے لیے سازگار ماحول بھی پیدا کرنے کی کوشش کی:

- عورت کو باوقار لباس پہننے کی ہدایت کی جس سے اس کا جسم محفوظ ہو سکے۔
- نگاہیں نیچی رکھنے اور نامحرم عورتوں کی طرف نہ دیکھنے کی ہدایت کی۔

- مرد اور عورت کے درمیان خلوت کو ممنوع قرار دیا۔
- مسجدوں تک میں مردوں اور عورتوں کی الگ اور دُور دُور صفیں قائم کرنے کا انتظام کیا۔
- مخلوط تعلیم کی اجازت نہیں دی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ اسکول
- اور کالج ہونے چاہئیں۔
- شادی کو آسان بنایا اور معاشرے میں اسے تکلّف سے دُور رکھ کر عام عادت بنایا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جنسی تعلقات کے سلسلے میں اسلامی طرزِ عمل اور یہاں وہاں سے درآمد زوال آمادہ طرزِ عمل میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ غیر اسلامی طرزِ عمل یہاں تک پہنچا کہ فریقین کی رضامندی سے زنا تھا تو نا جائز نہیں رہ گیا اور اِدھر اُدھر پھینکے ہوئے بچّوں کے سلسلے میں یہ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں رہ گئی کہ وہ کہاں سے آئے؟

ہم مسلمان اس طرزِ عمل کو مسترد کرتے ہیں، زنا کو ایک مہلک برائی مانتے ہیں اور وہاں تک پہنچانے والے تمام دروازے بند کرنے پر زور دیتے ہیں پھر جرم سرزد ہو جانے کی صورت میں کوڑے یا سنگساری کی سزا دیتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ خاندان ہی شریف لوگوں کے لیے ملنے کی جائز جگہ ہے۔

جس طرح اسلام آبرو کے تحفّظ پر زور دیتا ہے اسی طرح کسی کی بے حرمتی کو بھی ناپسند کرتا ہے اور اس پر سزا دیتا ہے۔

لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کے خلاف تہمت طرازی اور انھیں رسوا کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتے۔

اس طرح کے لوگوں کو دوسروں کی آبرو سے کھیلنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا اسلام ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ یا تو چار گواہ پیش کریں ورنہ اسّی کوڑے سزا کے طور پر کھائیں۔

اس طرح کے تہمت طرازوں کو سزا دینا اور انھیں ہمیشہ کے لیے جھوٹا قرار دے کر ان کی گواہی کو تسلیم نہ کرنا بلاشبہ ایک سخت سزا ہے لیکن نہایت منصفانہ بھی ہے تبھی تہمت طرازی کی روک تھام بھی ہو سکتی ہے۔

شریف عورتوں کے لیے ضمانت ہونی چاہیے کہ وہ سکون و اطمینان سے زندگی گزار سکیں۔ پھر یہ بھی قابلِ توجہ بات ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ غلطی اپنی جگہ ختم ہو جائے۔ کوئی پھر اس کے بارے میں گفتگو نہ کرے اور نہ ہر جگہ لوگ اسے زبان کا چٹخارہ بنائیں۔

فرض کر لیا جائے کہ کسی شخص نے تنہا کوئی جنسی جرم ہوتے دیکھا تو اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ کسی اور سے اس کا تذکرہ کرے۔ کون جانتا ہے کہ یہ پوشیدہ رکھنا خطاکاروں کے لیے توبہ اور پاکیزگی کا ذریعہ بن جائے۔

دین اس کے انتظار میں نہیں رہتا کہ بس کوئی قدم لڑکھڑائے اور جھٹ گرنے والے کو جکڑ لے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ۔

اور اگر اللہ لوگوں کی کمائی پر ان کو پکڑے تو زمین پر ایک بھی ہلنے جلنے والا نہ چھوڑے۔

(فاطر۔ ۴۵)

دین اس کا پورا موقع دیتا ہے کہ پردہ پوشی ہو تاکہ بھٹکا ہوا آدمی راہ راست پر آجائے اسی لیے مومن پر یہ لازم کیا گیا ہے کہ وہ گندی افواہوں سے اپنے کان بند رکھے اور جب تک کسی کے پاس کافی ثبوت نہ ہو ـــــ جو بہت دشوار ہے ـــــ اس کو جھوٹا قرار دیا جائے۔

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ لَوْلَا جَآءُوْا عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ

کیوں نہ جب تم نے اس کو سنا تھا تو ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں نے اپنے لوگوں پر بھلا خیال کیا ہوتا اور کہا ہوتا کہ یہ صریح طوفان ہے۔ کیوں نہ وہ اس بات پر چار گواہ لائے پھر جب وہ گواہ نہیں لائے تو اللہ

عِنْدَ اللّٰہِ ھُمُ الْکَاذِبُوْنَ۔ کے یہاں وہی لوگ جھوٹے ہیں۔

(النور۔ ۱۲۔۱۳)

ظاہر ہے اسلام اس جرم سے نفرت کرتا ہے اور اس پر دنیا و آخرت میں رسوائی و بربادی کی دھمکی دیتا ہے۔ ساتھ ہی ان لوگوں کو بھی دھمکی دیتا ہے جو چھپ کر یہ جرم کرتے ہیں پھر لوگوں کے سامنے شریف و پاکباز بن کر ظاہر ہوتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰہِ وَھُوَ مَعَھُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ وَکَانَ اللّٰہُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا۔

اللہ کو دغا باز گنہ گار پسند نہیں جو لوگوں سے شرماتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے جبکہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ مشورہ کرتے ہیں رات کو اس بات کا جس سے اللہ راضی نہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کے قابو میں ہے۔

(النساء: ۱۰۷ - ۱۰۸)

اگرچہ دین اس طرح کے عملی منافقین سے نفرت کا اظہار کرتا ہے تاہم وہ چھپے ہوئے گناہ گاروں کی پردہ پوشی کو ترجیح دیتا ہے اور ان کے لیے امید کے دروازے کھلے رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کریں۔

اب جس کا سب کچھ طشت ازبام ہی ہو جائے اسے جانور کی طرح پٹنا ہی پڑے گا اور جس سزا کا وہ مستحق ہے اسے ملے گی۔

البتہ اسلام گھرانوں کو اور میاں بیوی کے تعلقات کو خاص نگاہ سے دیکھتا ہے۔ گمان کو جھوٹ بنایا گیا ہے اور تہمت طرازی کو ثبوت کے بغیر، وبال کا ذریعہ۔ پھر بھی کبھی شوہر کوئی ایسی بات دیکھ سکتا ہے جسے وہ ثابت بھی نہ کر سکتا ہو لیکن اسے برداشت بھی نہ کر سکتا ہو۔ یہ معاملہ سنگین نوعیت کا ہو جاتا ہے۔ اب یا تو شوہر جو کچھ کہہ رہا ہے، اس سے پیچھے ہٹنے کی کوئی گنجائش باقی نہ سمجھتا ہو یا پھر اپنی بیوی پر الزام نہ لگائے مشکوک صورت حال کو ختم کرنے کے لیے لعان کا طریقہ بنایا ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ اَزْوَاجَھُمْ وَلَمْ اور جو لوگ اپنی بیویوں کو عیب لگائیں اور

يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ إِنَّهُ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ وَالْخَامِسَةَ أَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَا إِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِينَ۔ (النور۔ ۶-۹)

ان کے پاس شاہد نہ ہو سوائے ان کی اپنی جان کے۔ تو ایسے شخص کی گواہی کی یہ صورت ہے کہ چار بار گواہی دے اللہ کی قسم کھا کر کہ وہ شخص سچا ہے اور پانچویں بار یہ کہ اللہ کی پھٹکار ہو اس شخص پر اگر وہ جھوٹا ہو اور عورت سے مار یوں ٹل جائے گی کہ وہ چار بار گواہی دے اللہ کی قسم کھا کر کہ وہ شخص جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہ اس عورت پر اللہ کا غضب آئے اگر وہ شخص سچا ہے۔

اسلامی معاشرہ میں اس کی نوبت شاذ و نادر ہی آتی ہے کیونکہ اس کی جامع تعلیمات اس تکلیف دہ صورت حال تک پہنچنے نہیں دیتیں۔

اسلامی خاندان، دنیا کے مختلف حصوں میں رہنے والے دیگر خاندانوں کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرا اور پاکیزہ پہلے بھی رہا ہے اور آج بھی ہے اور اس استحکام کا سہرا اسلامی تعلیمات ہی کے سر ہے۔

شراب و منشیات

شراب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو عقل پر چھا جائے اور اسے متاثر کردے، چاہے وہ کسی مشروب کی شکل میں ہو یا افیون اور چرس جیسی خشک چیز کے روپ میں۔

کچھ لوگ صرف انگور، جو اور گنے وغیرہ کے رس سے بنائی ہوئی نشہ آور شراب ہی کو شراب سمجھتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے، جن قوموں میں سیال شراب کا رواج عام ہے ان کی حالت ان قوموں سے بہتر ہے جن میں افیون، چرس جیسی منشیات کا رواج ہے۔

پھر یہ خیال احمقانہ ہوگا کہ کم نقصان والی چیز کو تو شریعت ممنوع قرار دے اور زیادہ نقصان پہنچانے والی چیز پر پابندی نہ لگائے۔

شراب کے بارے میں قدیم زمانے سے جانا جاتا ہے کہ وہ ذہن کو معطّل اور اس کی صلاحیتوں کو متاثر کرتی ہے۔ جس سے انسان اپنے باعزت درجے سے گر جاتا ہے اور اپنی وہ بہترین ذہانت کھو دیتا ہے جس کی بدولت وہ دوسری مخلوقات پر امتیاز رکھتا ہے۔

قرآن کریم شراب کو حرام قرار دیتے ہوئے اس کے ذہنی و نفسیاتی برے اثرات کا ذکر کرتا ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ	شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تم میں دشمنی اور بیر ڈالے اور

وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ۔ (المائدۃ - ۹۱)
تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے روکے۔

آدمی اگر اپنے ذہن کی رَو بے لگام چھوڑ دے تو اس کے جذبات بے قابو ہو جاتے ہیں اسی لیے شرابی لبا اوقات جانوروں جیسی حرکات کرنے لگتا ہے۔

بہت سی قومیں منشیات کو اپنے حال و مستقبل کے لیے مضر سمجھنے لگی ہیں اور اسی لیے ان کی روک تھام پر انتہائی زور لگا رہی ہیں، بعض ممالک نے تو منشیات استعمال کرنے اور اسے پھیلانے کی سزا پھانسی مقرر کر دی ہے پھر منشیات کے مضر اثرات کے بارے میں کافی شور شرابا مچایا جا رہا ہے۔

لوگوں کی حالت بھی عجیب ہے، مثلاً وہ یقین رکھتے ہیں کہ تمباکو نوشی کا کوئی فائدہ نہیں، صحت اور پیسے کی بربادی کے علاوہ اس سے خوفناک امراض پیدا ہوتے ہیں لیکن اس احمقانہ عادت میں چھوٹے بڑے ہر طرح کے لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔

لگتا ہے کہ بعض لوگ وقتی طور پر اپنے اعصاب کو سکون دینے کے لیے ایسا کرتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس عارضی سکون کے بعد زیادہ تکلیف دہ حالت سامنے آجاتی ہے۔ اور طرح طرح کے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے قرآن کریم شراب اور جوئے کے بارے میں کہتا ہے:

فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ (البقرۃ - ۲۱۹)
ان دونوں میں بڑا گناہ اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں (مگر) ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت بڑا ہے۔

یعنی نشہ کرنے والے کو عارضی طور پر سکون یا لذت کا جو احساس ہوتا ہے اس کے مقابلے میں اس کے نتائج کہیں زیادہ نقصان دہ ہوتے ہیں۔

اسی طرح جوا برائی اور دشمنی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے اور غریب اس سے اور بدحال ہو جاتے ہیں۔

رواں صدی کے وسط میں امریکہ نے شراب کے مضر توں کا احساس کر کے اس پر

پابندی عائد کرنی چاہی اور اس کے لیے ایک اچھا قانون بھی بنا دیا لیکن اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ اس نے اسلام کی طرح تدریجی پابندی کا راستہ نہیں اختیار کیا تھا۔

اسلام منشیات کو حرام قرار دیتا ہے اور نشہ کرنے والے کو ۸۰ کوڑے سزا دیتا ہے کیونکہ نشہ کرنے والے بکواس میں تہمت طرازی تک پہنچ جاتے ہیں اور بے گناہ عورتوں پر تہمت طرازی کی یہی سزا ہے۔

پھر اسلام شراب پینے ہی پر سزا دیتا ہے نشہ پیدا ہونے کی شرط عائد نہیں کرتا۔ جو بھی شراب پی لے گا، چاہے اسے نشہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اسے سزا دی جائے گی۔

جو معاشرے منشیات کو کھلی چھوٹ دیے ہوئے ہیں وہ یقیناً تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔

ارتداد

اسلام سے پھر جانا، یعنی ارتداد، ایسا کرنے والے کا تعلق معاشرے سے کاٹ دیتا ہے اور اس سے زندگی کا حق چھین لیتا ہے۔

کچھ لوگ اس پر کافی شور و غوغا مچاتے ہیں اور اسے آزادی رائے پر پابندی قرار دیتے ہیں ہر آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ چاہے تو ایمان لائے اور چاہے تو انکار کرے۔

کسی بھی انسان کے اس حق کا ہم بھی احترام کرتے ہیں کہ وہ چاہے ایمان لائے یا انکار کرے۔ لیکن یہ حق کسی فرد کو اسی وقت تک حاصل رہتا ہے جب تک اس پر بات واضح نہ ہو۔ اس نے اس معاملہ کا مطالعہ اور جائزہ ہی نہ لیا ہو نہ کوئی رائے قائم کر سکا ہو۔ وہ پوری عمر اسی حالت میں رہ سکتا ہے۔

اگر وہ کسی بھی دوسرے مذہب کو اختیار کر لے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا، تب بھی امن و اطمینان سے زندگی گزارنے کا اس کا حق برقرار رہے گا۔

لیکن اگر وہ اسلام کو ترجیح دیتا ہے تو پھر اسے مخلص ہونا چاہیے اور اس کے تمام احکام کو تسلیم کرنا چاہیے۔

کیا یہ آزادی رائے کہی جائے گی کہ اسلام کو ماننے کے بعد اس کے احکام کو پامال کیا جائے؟ یا دوسرے الفاظ میں کیا آزادی رائے کسی انسانی معاشرے میں کسی شخص کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ اس معاشرے کی جڑیں ہی کھودنے کی کوشش کرے؟

کیا وطن سے غداری اور دشمن کے لیے جاسوسی کو آزادی رائے کہا جا سکتا ہے؟

کیا وطن میں انتشار پھیلانا اور اس کے قوانین اور مقدس روایات کو پامال کرنا آزادیٔ رائے قرار دیا جائے گا؟

ارتداد کے مسئلے کو واضح طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اسلام ہر خاص و عام کے سامنے ایک عقیدہ و شریعت کی صورت میں پیش ہے۔ اس کی کتاب (قرآن کریم) اور اس کے رسولؐ کی سنت سے مثلاً یہ ثابت ہے کہ اللہ ایک ہے، آخرت حق ہے، قصاص حق ہے اور روزہ حق ہے۔

اب جو بھی اسلام کو اختیار کرتا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ ان باتوں کو پسند کرتا ہے اور انھیں نافذ کرتا ہے۔

اب اگر کوئی یہ کہنے لگے کہ: میں اللہ پر تو ایمان رکھتا ہوں مگر آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، یا ان دونوں پر ایمان ہے مگر روزے یا قصاص کو نہیں مانتا وغیرہ وغیرہ تو کیا ایسے شخص کو اس طرح خدا کے دین سے کھلواڑ کرنے کی چھوٹ دی جاسکتی ہے۔؟

یا تو وہ اپنی غلطی سے رجوع کرے ورنہ اس سے نجات ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے جو معاشرہ بھی اپنے وجود کا تحفظ کرے اور اس سے کھلواڑ کی اجازت نہ دے اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

اگر کسی شخص کے دل میں کوئی شبہ پیدا ہوتا ہے تو یہ اہلِ علم کی ذمّے داری ہے کہ اسے دور کریں۔

پھر اگر وہ شبہ اس کے دل میں رہتا ہے اس کو پھیلانے کی کوشش نہیں کرتا تو بھی کوئی اعتراض کی بات نہیں۔

لیکن اگر کوئی اپنے نظام کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کرتا ہے مثلاً سود کی تبلیغ کرنے لگتا ہے تو اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام سے اسے قبول کرانے کی کوشش حماقت ہی ہوگی، اور جو اس کی بنیادوں کو ڈھادینے پر تلا ہوا ہو اسے زندگی کا حق دینے کا مطالبہ تعجب خیز ہوگا۔

دنیا کا کوئی معاشرہ اس غلط طریقے سے خودکشی نہیں کرتا۔ اسی لیے اس میں کوئی

انوکھی بات نہیں ہوگی کہ مرتد کو پہلے توبہ کرانے کی کوشش کی جائے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اسے زندگی کے حق سے محروم کر دیا جائے۔

قرآن کریم میں ارتداد کی کوئی متعین سزا واضح طور پر نہیں بیان کی گئی ہے البتہ سنت میں آتا ہے:

"کسی مسلمان کا خون صرف تین صورتوں میں بہانا جائز ہے۔
شادی شدہ ہونے کے بعد زناکاری۔
ناحق کسی کی جان لینا جبکہ جان لینا اللہ نے حرام قرار دے رکھا ہے۔
اور اپنے دین و جماعت کو چھوڑنے والا۔"

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ یہودیوں نے ارتداد کی آزادی کو اسلام کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے لیے استعمال کیا وہ اسلام لانے کا اعلان کرتے تھے پھر جلدی مرتد ہو جاتے تھے ان کا مقصد یہ دکھانا ہوتا تھا کہ ان میں دینی تعصب نہیں ہے لیکن اسلام میں ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے اس میں باقی نہیں رہا جا سکتا۔ گویا سارا معاملہ اسلام سے کھلواڑ کرنے اور اسے رسوا کرنے کا تھا۔

صلح حدیبیہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے مانا تھا کہ جو بھی اسلام کو پسند نہ کرے وہ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جا سکتا ہے لیکن ایک شخص نے بھی ایسا نہیں کیا کہ توحید پر شرک کو ترجیح دی ہو۔ بعد میں حضرت عمرؓ کے دور میں ایک قبائلی سردار جبلہ بن ایہم کے بارے میں آتا ہے کہ طوافِ کعبہ کے دوران اس کی چادر پر کسی عام آدمی کا پیر پڑ گیا تو اس نے اسے چانٹا مار دیا۔ حضرت عمرؓ کے پاس معاملہ گیا تو انھوں نے کہا وہ آدمی تمہیں بھی ویسے ہی چانٹا مارے گا۔ جبلہ نے کہا کہ میں سردار ہوں اور وہ ایک عام آدمی ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام نے سب کو برابر کا درجہ دیا ہے۔ جبلہ رات کو بھاگ کر روم چلا گیا اور وہاں عیسائی بن کر پناہ لے لی۔ جبلہ توحید پر تثلیث کو ترجیح نہیں دیتا تھا محض ذاتی اکڑفوں کی وجہ سے ایسا کر بیٹھا تھا اور آخر میں اس پر بہت پچھتاتا بھی تھا۔

آج بھی بہت سی طاقتیں اسلامی وجود کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی جدّوجہد کر رہی ہیں اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اپنے مذہب کو غلط ملط ہونے سے بچائیں اور واضح اور روشن انداز میں اسے سمجھیں۔ غداروں کے خلاف کارروائی ضروری ہے۔

عیاری بنانے والے بہت سے گروہ اسلام اور اس کے رسول اور کتاب سے نفرت کی بنا پر عقائد و اخلاق کے تعلق سے شبہات اور بے یقینی پیدا کر کے اسلامی معاشرہ کو الٹ پلٹ دینا چاہتے ہیں۔

اس طرح کی کوششوں کی روک تھام ضروری ہے۔

تمام اسلامی سزاؤں کو مانتے ہوئے یہ سمجھنا چاہیے کہ ان کے نفاذ ہی میں معاشرے کی ذہنی و سماجی صحت مضمر ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔

"روئے زمین پر ایک (شرعی) سزا کا نفاذ چالیس روز کی بارش سے زیادہ بابرکت ہے"

کیونکہ بارش مردہ زمین ہی کو زندہ کرتی ہے جبکہ شرعی سزائیں مرے ہوئے اخلاق و کردار کو زندہ کرتی ہیں اور قوم میں وبا کے پھیلنے اور اس کے حال و مستقبل کو تباہ ہونے سے بچاتی ہیں۔

قتل اور قصاص

قاتل نے جب جان بوجھ کر کسی کی جان لے لی ہے تو اسے زندگی سے محروم کر دینا ہی انصاف ہے اس پر رحم کھانے کی کوئی گنجائش نہیں۔

مختلف حلقوں سے یہ شور اٹھنے لگا ہے کہ پھانسی کی سزا منسوخ ہو جانی چاہیے کیونکہ مجرم ایک طرح کا مریض ہوتا ہے۔ اس کا علاج کیا جانا چاہیے۔ اس کے قتل سے کوئی فائدہ نہیں مقتول کو زندگی واپس نہیں مل سکتی۔

اور حیرت کی بات یہ ہے کہ امریکا و یورپ میں اس رائے کو ماننے والے بھی ہو گئے جنھوں نے پھانسی کی سزا منسوخ کر کے اس کی جگہ عمر قید کی سزا بحال کر دی۔

آخر یہ لغو دلیل کے سوا کیا ہے کہ قصاص (یعنی قاتل کو قتل کر دیا جائے) سے مظلوم مقتول کو زندگی واپس نہیں دلائی جا سکتی۔ قاتل کو اس غرض سے قتل کیا ہی کب جاتا ہے؟ اس کو تو سزائے موت اس لیے دی جاتی ہے کہ اس طرح کا جرم کرنے کے بارے میں جو بھی سوچے وہ یقینی طور پر جان لے کہ اسے بھی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اس طرح پورے معاشرے کی زندگی کا تحفظ ہو گا۔

بیشتر مجرم دوسروں کی زندگی پر اس لیے ہاتھ ڈالنے کی جسارت کرتے ہیں کہ انھیں اس کا خیال نہیں ہوتا کہ انھیں اس کی قیمت چکانی پڑے گی۔ اگر انھیں یہ معلوم رہے کہ کسی کو قتل کرنے کے بعد انھیں بھی لازماً قتل ہونا پڑے گا تو اپنے اقدام سے پہلے سو بار سوچیں گے اور رک جائیں گے۔

قرآن کریم کتنے جامع الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کرتا ہے:

وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیَاۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ۔ (البقرۃ۔ ۱۷۹)

عقل وخرد رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔

یعنی قاتل کو سزائے موت دینے کے نتیجے میں ملک میں امن وامان کا دور دورہ ہو جائے گا اور جانیں محفوظ ہو جائیں گی۔

قاتل چاہے ذہنی و نفسیاتی مریض ہو یا نہ ہو اسے چھوڑ دینے کا کوئی معقول سبب نہیں ہے۔

کتنے ہی نفسیاتی و نظریاتی امراض ہیں جو افراد کے طرزِ سلوک میں نمایاں ہوتے ہیں۔ متعدد عبادات و ہدایات موجود ہیں جن سے وہ لوگ رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں جو امن و عافیت چاہتے ہیں اور باعزت زندگی کو ترجیح دیتے ہوئے کسی کی جان ومال و آبرو کی طرف ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ کیا کسی ایسے شخص کو معذور قرار دیا جا سکتا ہے جو شہوت کے غلبہ میں دوسروں کی آبرو پر حملے کرے، یا کسی ایسے شخص کو لوگوں کا خون بہانے کی چھوٹ دی جا سکتی ہے جو مزاجاً انحراف کا شکار ہو۔ آخر پھر پاگل کتوں اور خونخوار بھیڑیوں کو کیوں مارا جاتا ہے؟

قاتل کو بلاشبہ قتل کی سزا ملنی چاہیے اس میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔

بعض ممالک میں حکمِ الٰہی کو نظر انداز کرنے اور شیطانی حکم کو سر بلند کرنے کے لیے قاتلوں کو چھوڑ دیا گیا۔ پھر اس کا کیا نتیجہ بھگتنا پڑا؟ جرم عام ہو گیا، انتشار پھیل گیا لوگ سڑکوں پر نکلتے ہوئے ڈرنے لگے کہ کہیں گولیوں کا شکار نہ ہو جائیں اور گھروں میں ہر دم خوف مسلط رہنے لگا کہ مجرم نہ گھس آئیں۔

کیا مجرمین پر رحم کھانے اور انھیں نفسیاتی مریض بتانے کا یہی مقصد تھا؟

اللہ تعالیٰ کسی ایک انسان کی زندگی پر حملہ تمام انسانوں کے حقِ زندگی پر حملہ قرار دیتا ہے۔

اَنَّہٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ

جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین

فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا وَمَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا۔ (المائدۃ ۔ ۳۲)

میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

زندہ رکھنا کبھی کسی ڈوبتے ہوئے کو بچا کر بھی ہوتا ہے، کسی مظلوم شخص کو ظالموں کے پنجوں سے چھڑا کر بھی ہوتا ہے اور کبھی کسی قاتل سے قصاص لے کر پورے معاشرے کے حقِ زندگی کو مضبوط و مستحکم کر کے بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک قاتل کو سزائے موت دینا بہت سوں کی زندگی کے تحفظ کا سبب بن جاتا ہے جو خونخوار قاتل کے زندہ رہنے کی صورت میں اس کا شکار ہو سکتے تھے۔ قصاص قدیم قانونِ فطرت ہے۔

وَکَتَبْنَا عَلَیْهِمْ فِیْهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ کَفَّارَةٌ لَّهٗ۔ (المائدہ ۔ ۴۵)

ہم نے توراۃ میں یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ۔ پھر جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔

یہاں صدقہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے شرعی حق سے دستبردار ہو جائے مقتول کے وارثوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ مال کی کوئی مقدار لے کر قاتل کو چھوڑ دیں یا پھر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اسے معاف کر دیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ "معاف کر دینے سے اللہ تعالیٰ بندے کی عزت ہی بڑھاتا ہے"۔
یہاں قاتل کو سزائے موت سے بچایا جا سکتا ہے لیکن ریاست کا یہ حق باقی رہتا ہے کہ وہ امن کو برباد کرنے والوں کی مناسب سزائیں دے۔

کوئی شخص سوال کرسکتا ہے کہ وارثوں کے معاف کر دینے سے قصاص کیوں ساقط ہو جاتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ جرائم کے پس منظر سے بہت سی چیزیں متعلق ہوتی ہیں۔ کچھ لوگوں کو مادی نقصان اتنی تکلیف نہیں پہنچاتا جتنا معنوی ذلت تکلیف پہنچاتی ہے۔ اگر کوئی طاقتور اسے مار دے تو اسے بدن کی تکلیف سے اتنا رنج نہیں ہوتا جتنا اپنی بے بسی اور کمزوری کے احساس سے ہوتا ہے۔ جب اُسے دشمن کی زندگی اور موت کا حق دے دیا جائے اور لوگ اس سے معافی مانگنے آئیں اور اسے عملاً بالادست تسلیم کریں تو اس سے اسے تسلّی و تشفّی ہو جاتی ہے۔

پھر بھی انفرادی حق سے دستبرداری معاشرے کے حق کو ختم نہیں کرتی۔

تعزیرات

معاشرے میں امن و امان کا بول بالا کرنے اور انتشار و ظلم کے رجحانات کی روک تھام کے لیے ریاست کو مختلف قسم کی سزائیں مقرر کرنے کا حق ہے۔

کچھ جرائم ایسے ہیں شریعت نے جن کی کسی دنیاوی سزا کا ذکر نہیں کیا ہے مثلاً سود خوری میدانِ جنگ سے فرار، دواؤں اور دیگر اشیاء میں ملاوٹ وغیرہ وغیرہ۔

ان جرائم کے استیصال کے لیے عدالت مناسب سزا دے سکتی ہے، جیل میں ڈال کر کوڑے لگوا کر، مالی جرمانے عائد کر کے اور جاسوسی اور وطن سے غداری کی صورتوں میں سزائے موت تک دے کر۔

ساری دنیا جرائم پر سزا دینے کے اصول کو تسلیم کرتی ہے البتہ کتنی اور کیسی سزا دی جائے اس میں حالات کے مطابق فرق ہو سکتا ہے۔

تعزیرات کی حد میں وہ جرائم بھی آجاتے ہیں جو شرعی حدود کی حد تک نہ پہنچے ہوں مثلاً مقررہ مقدار سے کم یا غیر محفوظ چیز کی چوری یا مثلاً تہمت طرازی کی حد تک پہنچے بغیر دشنام طرازی۔

اہمیت اس بات کی ہے کہ سزائیں انصاف کے اصولوں سے ہم آہنگ ہوں۔ سختی یا نرمی میں ظلم کی حد تک نہ پہنچ جائیں۔ ان سزاؤں کی تعین قانون، تربیت اور سماجی اصلاح کے میدانوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین کے اداروں کے ذریعہ ہونی چاہیے۔ البتہ قاضی (جج) کو زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم سزا دینے کا اختیار ہونا چاہیے۔

قاضی کو یہ بات بھی ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ صرف جرم ہی پر سزا دی جاسکتی ہے جو حاکم کسی محکوم کو بلا گناہ زد و کوب کراتا یا اس پر ظلم کرتا ہے تو اس کا مواخذہ ہونا چاہیے چاہے وہ جتنے بڑے منصب پر فائز ہو۔ منصب ظلم کرنے کا ذریعہ نہیں ہے اور اسلام اس کے انتظار میں نہیں رہتا کہ کتنی جلدی کوئی غلط کار ملے اور اس پر سزا نافذ کر دے۔

دین تو خطا کاروں کی ستر پوشی اور ان کے ساتھ نرمی برتنے پر زور دیتا ہے۔ ہاں اگر مجرم بار بار جرم کرتا ہے تو یہ معاشرے کے ساتھ بد دیانتی اور انصاف کی خلاف ورزی ہوگی کہ اسے جرم کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔

فقہائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ حدود کا نفاذ اس مجرم پر ہونا چاہیے جو نہ اس کی پرواہ کرتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے اور نہ برائی کرنے سے ڈر محسوس کرتا ہے۔

کبھی جن پر حد قائم کی جاتی ہے وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ عادی مجرم نہیں ہیں بلکہ ان سے ایک بار غلطی ہوگئی ہے اور اسے معاف کر دیا جانا چاہیے۔ لیکن سمجھدار قاضی اس سے دھوکا نہیں کھاتے۔

ابن حزم اس عنوان کے تحت کہ "خدا کسی بندے کو پہلے گناہ پر نہیں پکڑتا" روایت کرتے ہیں:

"حضرت ابو بکرؓ کے پاس ایک چور لایا گیا۔ انھوں نے فیصلہ دیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

چور نے کہا: اے خلیفۂ رسولؐ مجھے معاف کر دیجیے میں نے اس سے پہلے کبھی چوری نہیں کی۔

حضرت ابو بکرؓ نے کہا: تم جھوٹے ہو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اللہ تعالیٰ پہلے گناہ پر کسی مومن کو نہیں پکڑ لیتا۔"

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ:

حضرت عمرؓ کے پاس ایک چور لایا گیا۔ وہ کہنے لگا خدا کی قسم میں نے اس سے پہلے

کبھی چوری نہیں کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، عمر کے پروردگار کی قسم تم جھوٹے ہو۔ اللہ تعالیٰ پہلے گناہ پر کسی بندے کو نہیں پکڑتا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا: اللہ اس سے زیادہ تحمل والا ہے کہ وہ پہلے ہی گناہ پر اپنے بندے کو پکڑ لے۔

تب حضرت عمرؓ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔

ہاتھ کٹنے کے بعد حضرت علیؓ نے اس کے پاس جاکر کہا: میں تمہیں خدا کی قسم دلاتا ہوں تم نے کتنی بار چوری کی۔ اس نے کہا: اکیس مرتبہ۔"



ان خلفاء کو حد جاری کرتے وقت یہ یقین تھا کہ کسی شخص کا جرم طشت از بام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عادی مجرم بن چکا ہے۔

اب اگر یہ ظاہر ہوجائے کہ مجرم عادی نہیں بلکہ اس سے غلطی ہوگئی تو کیا اسے چھوڑ دیا جائے گا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

"اپنے درمیان حدود کو معاف کرلیا کرو۔ جو حد مجھ تک پہنچ جائے گی وہ واجب ہوجائے گی۔"

ابن حزم کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس کا حال لوگوں سے پوشیدہ ہو اور اس سے پہلی بار غلطی ہوجائے تو اسے معاف کردیا جائے گا لیکن جو جرم کو تکلیف دہ حد تک ظاہر کرے اس کا معاملہ قاضی کے پاس لے جایا جائے گا۔

ظاہر ہے شرعی حدود کے نفاذ کے لیے ثبوت کی فراہمی دشوار ہے اور ایک عام آدمی کے بارے میں تو بہت کم ثبوت فراہم ہوسکتا ہے۔

پکڑ میں تو وہی آئے گا جو چیلنج کرکے جرم کرے اور پاگل پن میں اتنا اندھا ہوچکا ہو کہ کسی طرح کی احتیاط نہ کرے۔

اور اس طرح کے کسی شخص کے حال پر افسوس نہیں کیا جاسکتا۔ یہ معاشرے کا حق

ہے کہ اس کی سزا سے راحت حاصل کرے۔

حاکم (قاضی) کو چاہیے کہ جو لوگ پکڑ میں آئیں ان کے حالات کو دیکھے اگر ان لوگوں سے معاشرے کو نقصان پہنچ رہا ہو تو ان پر حد جاری کرے اور اگر وہ طبعاً نیک ہوں اور صحیح توبہ کر چکے ہیں تو چھوڑ دے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا توبہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے؟

حق بات یہ ہے کہ امام کو اس کا اختیار ہے کہ وہ حد جاری کرے یا ساقط کرے لیکن پہلے پکڑے جانے والوں کے حالات، خود جرم کے پس منظر اور ان کے ایمان و توبہ کی نوعیت کا جائزہ لے لے۔ امام ابن تیمیہؒ کی یہی رائے ہے۔

امام ابو محمدؒ کہتے ہیں کہ توبہ سے تمام حدود ساقط ہو جاتے ہیں۔ امام شافعیؒ کا پہلا قول بھی یہی ہے جو ابو عبدالرحمٰن اشعری نے نقل کیا ہے۔ ان لوگوں کی دلیل یہ روایت ہے کہ:

حضرت ماعزؓ بن مالک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ مجھ پر حد جاری کیجیے۔ آپؐ نے چار مرتبہ درگزر سے کام لیا پھر سنگسار (رجم) کرنے کا حکم دیا۔ جب حضرت ماعزؓ کو پتھر لگنے لگے تو انھوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن پھر ایک ضرب کھا کر گر پڑے۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا "تم لوگوں نے انھیں چھوڑ کیوں نہیں دیا شاید اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کر لیتا۔ اگر تم انھیں اپنے کپڑے سے ڈھانک لیتے تو تمہارے لیے بہتر ہوتا۔"

حضرت علقمہ بن وائل کی ایک روایت میں ہے کہ:

"صبح منہ اندھیرے جب ایک عورت مسجد جا رہی تھی تو ایک آدمی زبردستی اسے دبوچ بیٹھا۔ عورت نے وہاں سے گزرنے والے مرد کو مدد کے لیے آواز دی (وہ دوڑے مگر) اتنے میں مجرم بھاگ گیا۔ اسی دوران کچھ اور لوگ گزرے تو عورت نے مدد کے لیے پکارا انھوں نے اس شخص کو جا پکڑا جسے عورت نے پہلے مدد کے لیے آواز دی تھی (مجرم ہاتھ نہیں لگا)

لوگ معاملہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ عورت نے کہا

کہ وہی شخص اس کا مجرم ہے (اندھیرے میں اصل مجرم کو پہچان نہیں سکی تھی) لوگوں نے بھی یہی بتایا کہ انھوں نے اسے بھاگتے ہوئے پکڑا تھا۔

جو شخص پکڑا گیا تھا اس نے کہا کہ میں تو عورت کی مدد کر کے اس کے مجرم کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اتنے میں ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔

عورت نے کہا کہ وہ جھوٹا ہے اسی نے حرکت کی تھی۔

آپؐ نے فرمایا: لے جاؤ اسے سنگسار کر دو۔

تب ایک شخص لوگوں کے درمیان سے اٹھا اور بولا: اسے سنگسار نہ کرو مجھے کرو کہ میں نے ہی اس کے ساتھ وہ جرم کیا تھا (اس نے اعتراف کر لیا)

تب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اے عورت) تجھے تو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا، اور جس نے (پہلے) مدد کی تھی اس کے لیے اچھے کلمات ارشاد فرمائے۔

حضرت عمرؓ نے عرض کیا: جس نے زنا کا اعتراف کیا ہے اسے رجم کر دیا جائے۔

آپؐ نے فرمایا: نہیں: اس نے اللہ سے توبہ کر لی۔

حضرت واثلہ بن اسقع سے روایت ہے کہ:

میں ایک روز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا۔ ایک آدمی آیا اور عرض کیا: یارسول اللہ مجھ سے ایک جرم سرزد ہو گیا ہے مجھ پر حد جاری فرما دیجیے۔ آپؐ نے اعراض فرمایا۔

وہ دوسری بار آیا تب بھی آپ نے اعراض فرمایا۔

اس نے تیسری بار بھی آکر وہی عرض کیا تب بھی آپؐ نے اعراض فرمایا۔

پھر نماز کا وقت ہو گیا۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ چوتھی بار آکر پھر وہی عرض کرنے لگا۔

آپؐ نے فرمایا: کیا تم نے اچھی طرح وضو کر کے ابھی نماز نہیں پڑھی؟ جاؤ یہی تمہارا کفارہ ہو گیا۔

حضرت انسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ مجھ سے زنا کا گناہ سرزد ہو گیا ہے مجھ پر حد جاری کر دیجیے، پھر

نماز کھڑی ہوگئی، اس نے آپؐ کے ساتھ نماز پڑھی۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: تمہاری نماز تمہارے لیے کفّارہ بن گئی۔

امام ابو محمدؒ کہتے ہیں کہ اس آیت سے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

(المائدۃ - ۳۳-۳۴)

جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کرتے ہیں اور ملک میں فساد کرانے کو دوڑتے ہیں، ان کی سزا یہی ہے کہ ان کو قتل کیا جائے، یا انھیں سولی پر چڑھایا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جانب سے کاٹے جائیں یا اُس جگہ سے دُور بھگا دیے جائیں۔ یہ ان کی رُسوائی ہے دنیا میں اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے سوائے ان کے جنھوں نے تمہارے قابو پانے سے پہلے توبہ کرلی تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

لوگوں نے یہ استنباط کیا ہے کہ نص قرآنی سے بھی یہ ثابت ہے اور اجماع سے بھی کہ پکڑے جانے سے پہلے توبہ سے رہزنی کی حد ساقط ہو جاتی ہے۔ اس لیے پکڑے جانے سے پہلے توبہ سے زنا، چوری، تہمت طرازی اور شراب نوشی وغیرہ سے متعلق تمام حدیں ساقط ہو جائیں گی۔

○

ابن حزم دیگر حدوں کو رہزنی کی حد پر قیاس نہیں کرتے کیونکہ وہ قیاس ہی کو نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ توبہ سے حدود ساقط نہیں ہوتیں۔

فقہاء کے نقطہ ہائے نظر کا جائزہ لینے کے بعد یہی بات دل کو لگتی ہے کہ قاضی مجرم کے حالات اور جرم کے پس منظر کو دیکھ کر ہی حد جاری کرنے کا فیصلہ کرے گا ورنہ دوسری سزائیں دے گا۔ یا توبہ کرنے والے کو معاف کردے گا۔

اسلامی شریعت

اسلامی شریعت

شریعت کا اطلاق خاص طور پر اسلام کے اس حصہ پر ہوتا ہے جو فقہ وقانون کی بحثوں سے متعلق ہے جبکہ شریعت کے عام مفہوم میں تمام اسلامی تعلیمات شامل ہیں۔

قرآن کریم میں تشریع کے الفاظ عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات جیسے تمام دینی احکام وہدایات کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ (الشوریٰ۔ ۱۳)

تمہارے لیے دین میں وہی راہ ڈال دی جس کا حکم نوح کو دیا تھا۔ اور جس کا حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو کیا، یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا۔ (الجاثیۃ۔ ۱۸)

پھر ہم نے تجھ کو دین کے کام کے ایک راستہ پر رکھا سو اسی پر چل۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ (المائدۃ۔ ۴۸)

اور تیرے پاس جو سیدھا راستہ آیا اسے چھوڑ کر ان کی خوشی پر مت چل۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کو ایک دستور اور راہ دی ہے اور اللہ چاہتا تو تمہیں ایک دین پر کر دیتا۔

آج کل ہر ہر شعبہ میں تخصص کا لحاظ کیا جاتا ہے مثلاً عقیدہ کا مطالعہ فقہ اور حقوق ومعاملات وغیرہ سے الگ شعبہ کی حیثیت سے کیا جاتا ہے اور فقہ اور حقوق ومعاملات کو اصطلاحاً "اسلامی شریعت" کا نام دیا جاتا ہے ——— اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔

شریعت کے مآخذ

ہم قطعی طور پر یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ وحیِ الٰہی کا سلسلہ قرآن کریم پر مکمل ہو گیا جو کچھ قرآن کریم میں ہے وہ بغیر کسی تحریف کے آسمانی پیغام ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے جو کچھ چاہتا ہے اسے ہمیشہ کے لیے اس کتاب میں محفوظ کر چکا ہے اب کسی اور کو اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔

کسی اور کتاب کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا۔

آج پوری دنیا میں اپنے بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا جو واحد کلام پایا جاتا ہے وہ قرآن کریم ہی میں مذکور ہے۔

اور قرآن کریم ان سارے حقائق کا جامع ہے جن کی طرف حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور ان سے پہلے حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ وغیرہ انبیائے کرامؑ نے دعوت دی تھی، اگر ان حضرات میں سے آج کوئی زندہ کیا جاتا اور اس آخری وحی کے آئینے میں اپنے پیغام کو صاف شفاف شکل میں دیکھتا تو سب سے پہلے اسے مانتا اور اسے ماننے کی دعوت دیتا۔

کتنے تعجب کی بات ہے کہ کسی شخص کے پاس جو بھی خط آتا ہے وہ اسے پڑھتا ہے اور جو کچھ اس میں لکھا ہوتا ہے اسے سمجھتا ہے پھر ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ اہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا خط ہی ہو سکتا ہے۔

لیکن مسلمانوں نے کتابِ الٰہی کی تنظیم صحیح ڈھنگ سے نہیں کی۔ انھوں نے اپنے

جذبات کا محور اس کے مقاصد پر غور وخوض سے زیادہ اس کتاب کے حروف کی تقدیس اور تجوید کو بنالیا۔

نہ اس طرح قرآن کی خدمت ہوسکتی ہے اور نہ ہی اس کے پیغام کا بول بالا ہوسکتا ہے۔ میں قرأت کی مجلسوں میں لوگوں کی آہ وبکا سنتا ہوں تو دہشت زدہ رہ جاتا ہوں عوام کا رویّہ تو یہ ہے اور خواص کا طرزِ عمل بھی قابلِ تنقید ہے۔

اور وہ یوں کہ قرآن فہمی پر ان کی توجہ محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

علّامہ سید سلیمان ندوی قرآن کریم کی خدمت میں علماء کی کوتاہی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ حقیقت ہے کہ اس پہلو سے ہمارے علماء نے قرآن کی خدمت میں کوتاہی برتی ہے۔ انھوں نے علومِ قرآن یعنی اس کے عقائد، اس کی فقہ، اخلاق اور سیاست وغیرہ پر کافی کتابیں نہیں لکھیں بلکہ ایک طرح سے اسے نظر انداز کیا اور اس کے مصداق بنے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (الفرقان۔ ۳۰)

اور رسول کہے گا اے میرے رب میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو متروک اور نشانۂ تضحیک بنالیا تھا۔

جبکہ صحابۂ کرامؓ رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ہر چیز پر قرآن ہی کو ترجیح دیتے تھے۔ چونکہ صحابۂ کرام کا دَور تدوین وتالیف کا دَور نہیں تھا اس لیے انھوں نے کتابیں نہیں مرتّب کیں یہ ذمّے داری ان کے بعد آنے والوں کی تھی لیکن وہ اس کی ادائگی سے غافل رہ گئے اور اشخاص کی رایوں، اسرائیلی حکایتوں اور اختلافی مسائل میں مشغول ہوگئے۔

قرآن کریم کی ترتیب چونکہ ابواب پر نہیں ہے اس لیے بہت سے لوگ اس سے اپنی مطلوبہ معلومات حتّٰی کہ منصوص مسائل تک نکالنے میں دشواریاں محسوس کرتے ہیں۔

جن علماء نے احکامِ قرآن کے موضوع پر کتابیں لکھیں انھوں نے بھی تفسیروں کی ترتیب کا لحاظ رکھا ابواب کے طرز پر مرتّب نہیں کیا۔ اور چونکہ حدیث، فقہ اور فتاویٰ وغیرہ ابواب کے طرز پر مرتّب ہوئے اس لیے لوگوں کو ان سے فائدہ اٹھانا آسان لگا اور وہ قرآن پر غور وخوض اور ہر چیز سے پہلے اسی کی طرف رجوع اور اس سے استنباط

سے دُور ہو گئے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے علماء قرآن پر ابواب کے مطابق آسان اسلوب میں جامع کتابیں لکھیں، آیات اور ثابت شدہ حدیثوں کے درمیان تطبیق کو نمایاں انداز میں پیش کریں اور موجودہ زمانہ کے لوگوں کے لیے انھیں سمجھنا آسان بنائیں۔ اس طرح وہ دین کی زبردست خدمت کریں گے اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے اور نوجوانوں کو الحاد اور دین سے برگشتگی سے بچانے کا ذریعہ بنیں گے۔

سنت قرآن ہی سے ماخوذ ہے

بہت سے محقق علماء کی رائے کے مطابق ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ صحیح احادیث میں جو احکام ملتے ہیں وہ قرآن کریم سے ماخوذ ہیں اور اس کا استنباط خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے الٰہی ہدایت و تائید سے فرمایا۔ اس لیے ہمارے لیے انھیں ماننا اور ان پر عمل کرنا واجب ہے بشرطیکہ وہ احکام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوں۔ قرآن کی اصطلاح میں اس فہم و استنباط کو کبھی "تبیین" اور کبھی "ارارۃ" کا نام دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (النحل ۔ ۴۴)

اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے۔ تاکہ لوگ خود بھی غور و فکر کریں۔

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ (النساء ۔ ۱۰۵)

اے نبیؐ ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہِ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سنت قرآن کے بعد دین کا دوسرا ماخذ و سرچشمہ ہے اور جو متواتر منقول ہو اس پر حکمِ قرآن کی طرح عمل کرنا واجب ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جو روایت صحیح طور پر منقول ہے اسے ہم لازماً

قبول کریں گے اور حکم و استدلال میں اسے وہی مقام دیں گے جس کی وہ حقدار ہے۔

قرآن کریم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا اولین ستون ہے۔ اس کی آیات آپؐ کے دل میں جاگزیں ہوئیں، آپ کے افکار و احساسات میں ان کے معانی و مقاصد جلوہ گر ہوئے اور آپؐ کا باطن وحی کی شعاعوں سے منوّر ہوا۔ اس لیے آپ سے اسی قول و عمل کا صدور ہو سکتا تھا جو قرآن اور اس کی ہدایات کے مطابق ہو۔

دینی امور میں رسول کریمؐ کی بات اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست وحی نہ ہو تو بھی ان قرآنی حقائق کی پیداوار ہے۔ جو آپ پر وحی کیے گئے اور جو آپ کے دل و دماغ میں رچ بس گئے اور پھر دوسروں کی رہنمائی کے لیے اسی سرچشمے سے نکلی۔

یہ سادہ لوحی ہو گی کہ نبوت کو محض ملاءِ اعلیٰ کی خبروں کی تکرار سمجھا جائے اور رسولؐ کو ایسا شخص مانا جائے جو نہ بات کرتا تھا نہ حکم و فتویٰ و نصیحت صادر کرتا تھا سوائے اس صورت میں جب فرشتہ آپ کے کانوں میں سرگوشی کر کے بتائے کہ کیا کہنا اور کیا کرنا ہے۔

رسالت اس سے زیادہ اہم چیز کا نام ہے۔

رسولِ کریمؐ کے دل و ضمیر میں جب قرآن کریم رچ بس گیا اور آپؐ کی رُوح قرآنی ہدایت اور بھلائی سے معمور ہو گئی تو آپ قرآن کی تفسیر بھی کرنے لگے اور حکمت کی بات بھی بولنے لگے۔ اور اس سلسلے میں قول و عمل، اثبات و جواب کی صورت میں ہزاروں کلمات سے قرآن کریم کی تشریح فرمائی۔

اس پورے معاملے میں سیرت نبوی تمام تر حق ہی ہو سکتی تھی کیونکہ یا تو شروع ہی میں حق آپؐ پر الہام ہو جاتا تھا یا پھر اگر کسی معاملے میں آپؐ اجتہاد فرماتے تھے اور غلطی ہو جاتی تھی تو وحیِ الٰہی آپؐ کو غلطی پر برقرار نہیں رہنے دیتی تھی۔ اس لیے اس کا کوئی امکان ہی نہیں ہو سکتا کہ سنّت میں کوئی چیز قرآن کے مخالف ہو۔

اب اگر کسی حدیث کے مفہوم میں تضاد نظر آئے تو یا تو وہ روایت ہی صحیح نہیں ہو گی یا اس کا مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو گی۔

افسوس یہ ہے کہ بہت سے مسلمان مذکورہ باتوں کی روشنی میں سنّت کو اچھی طرح سمجھنے

کی کوشش نہیں کرتے اور نہ سلفِ صالح کے طریقِ کار کی پیروی کرتے ہیں۔

آپ دیکھیں گے کہ ان میں بہت سے لوگ ـــــ قرآن کریم سے غفلت کی وجہ سے اپنی زبانوں پر ایسی روایات لے آتے ہیں جو ـــــ اگر قرآن کریم سے دل و دماغ کا تعلق مضبوط رکھتے تو ـــــ کبھی ذکر بھی نہ کرتے۔

مثلاً عوام میں مشہور شب برأت کی بات لیجیے۔

بعض مفسّرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں:

اِنَّآ اَنزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ — ہم نے اسے ایک مبارک رات میں نازل کیا۔

(الدخان۔۳)

مراد یہی شب برأت (پندرھویں شعبان کی رات) ہے پھر اس آیت کا:

فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ — یہ وہ رات ہے جس میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے۔

(الدخان۔ ۴)

کے حوالے سے عکرمہؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ اس رات میں سال بھر کے معاملات طے ہوتے ہیں اور موت وحیات وغیرہ لکھ دی جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں بہت سی روایات بھی نقل کی جاتی ہیں۔

جبکہ صحیح بات جس کی تائید قرآن کرتا ہے وہ یہ ہے کہ مبارک رات سے مراد شبِ قدر ہے۔ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ "مبارک رات سے مرادشبِ قدر ہی ہے جو پندرھویں شعبان کی رات کہے، وہ دلیل سے دور ہے نصِ قرآنی سے یہی ثابت ہے کہ وہ رات رمضان میں ہے۔"

جب قرآن کریم سے صراحتاً ایسا ثابت ہے تو پھر کس طرح لوگ ایسی روایات نقل کرتے ہیں جو اس کے خلاف ہوں۔ آخر اس طرح کی حدیثوں کو کیسے رائج ہونے دیا جاتا ہے؟

دنیا کے ساتھ مومن کے تعلق، عورت کے ساتھ مرد کے تعلق اور کافر کے ساتھ مسلمان کے تعلق وغیرہ جیسے اہم معاملات میں بھی بہت سی ایسی ہی روایات دخیل ہو گئی ہیں۔

آخر طبرانی کی اس روایت سے ملت کو سوائے معنوی و مادّی بربادی کے کیا حاصل ہو سکتا ہے کہ:

"مجھے دنیا کی بربادی کے لیے مبعوث کیا گیا ہے اس کی آبادکاری کے لیے نہیں"۔
دنیا کے ساتھ مومن کا تعلق اس مہلک محور پر قائم نہیں ہوسکتا۔
جس شخص نے قرآن کو سمجھا ہو اور یہ آیت پڑھی ہو کہ :

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ۗ (الاعراف ۔ ۱۰)
ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لیے یہاں سامانِ زیست فراہم کیا۔

وہ کیسے یہ مان سکتا ہے کہ دنیا کی بربادی ہی مقصد ہے۔
اس طرح کی باتوں کے ارد گرد، زندگی کی جدّوجہد اور دنیا کی آبادکاری سے فرار اختیار کرنے والے اور ایمان کے معاملات میں لاطائل بحثوں میں پڑنے والے بیکار لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔



عورتوں کے ساتھ مردوں کے تعلقات کے سلسلے میں بہت سے غلط احکام مشہور ہو گئے ہیں اور بہت سے صحیح احکام نظر انداز ہو گئے ہیں۔
پردے کے سلسلے میں نقاب کو اتنی زیادہ اہمیت دے دی گئی ہے کہ اسے عین دین بنا دیا گیا حتیٰ کہ قریبی رشتہ داروں تک کو عورت کی زینت دیکھنے کی اجازت نہیں۔ اس سلسلے میں ابن جریر طبری حضرت عائشہؓ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ "میں اپنی زینت کے ساتھ اپنے بھتیجے عبداللہ بن طفیل کے سامنے آئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند نہیں فرمایا۔ میں نے عرض کیا : یارسول اللہ! یہ میرا بھتیجا ہے۔
آپؐ نے فرمایا : بالغ ہونے کے بعد عورت کے لیے جائز نہیں کہ اس کا کوئی حصہ ظاہر ہو سوائے اس کے چہرے کے اور (آپؐ نے اپنے ہاتھ کے گٹے کو پکڑ کر بتایا) ہتھیلی کے"۔
مشہور محدث علامہ ناصر الدین البانی اس حدیث کو سند کے اعتبار سے ضعیف قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ عورت کے اپنے بھتیجوں کے سامنے اپنی زینت ظاہر کرنے کی اجازت نصِ قرآنی سے ثابت ہے۔ اس لیے یہ حدیث باطل ہے۔
اگر ہم شروع ہی سے قرآنی ہدایات کو پیش نظر رکھتے تو حدیث کی سند پر بحث کی ضرورت

ہی نہ ہوتی۔ اتنی بات کہ حدیث کا متن قرآن کے مخالف ہے اسے مسترد کرنے کے لیے کافی ہے۔

البانی کہتے ہیں کہ یہ روایت ابن جریج حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں جبکہ حضرت عائشہؓ سے براہِ راست ان کا واسطہ نہیں ہے اس لیے سند منقطع ہے۔ قرآن میں آتا ہے کہ:

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ (النور۔ ۳۱)	اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ اور اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے: شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے اپنے میل جول کی عورتیں اپنے لونڈی، غلام، وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔



امام احمد بن حنبلؒ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں قیامت کے قریب تلوار کے ساتھ معبوث کیا گیا ہوں یہاں تک کہ صرف اللہ کی عبادت ہونے لگے اور میرا رزق میرے نیزے کے سائے میں رکھا گیا ہے۔"

میں یہ مانتا ہوں کہ سرکشوں کی سرزنش اور بیخ کنی کے لیے تلوار اللہ کی رحمت بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس حدیث سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وہ دلآویز شریفانہ تصویر سامنے نہیں آتی جو قرآن کریم نے کھینچی ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ۔ اور ہم نے تمہیں جہان کے لوگوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔ (الانبیاء۔ ۱۰۷)

مذکورہ حدیث اگر صحیح بھی ہو تو اس کے پس منظر اور مناسبت کے ساتھ بیان کی جانی چاہیے۔ اور کتاب الٰہی اور سیرتِ رسولؐ کو پوری طرح سمجھ کر۔

اس حدیث سے ایسا حکم نکلتا ہے جس کا قائل ایک بھی فقیہ نہیں۔

توحید کو جہاد کا مقصد بتانا تاکہ لوگوں کے اسلام قبول کرنے تک جنگ نہ تھمے۔ ایک باطل مفہوم و حکم ہے جس کا اسلامی شریعت میں کہیں ذکر نہیں۔ بلکہ اہلِ کتاب کے ساتھ معاملہ میں یہ صریح نصِ قرآنی کے بھی خلاف ہے۔ جارحیت کرنے والوں نے جتنی بھی اذیت رسانی اور شدت پسندی سے کام لیا ہو ان کی شکست اور کچھ مالی جرمانے کے بعد انھیں ان کے عقیدہ پر چھوڑ دیا جائے گا اور بس۔

جزیرۃ العرب کے بت پرستوں کے ساتھ بیس برس تک اسی اصول کے مطابق عمل ہوتا رہا کہ "تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین" بلکہ انھیں اسلام سے پھر جانے کا حق بھی دیا گیا۔ اگر اسلام قبول کرنے کے بعد انھیں پسند نہ آیا ہو۔

پھر جب اس نرمی نے ان کی خونخواری میں اور شدت ہی پیدا کی اور یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ اسلام کے ساتھ غداری کے لیے صرف موقع ڈھونڈ رہے ہیں تب سورۂ برأت نازل ہوئی اور توبہ نہ کرنے والوں کی گردن پر تلوار رکھنے کی بات کہی گئی۔ پھر یہ اجازت بھی چند مہینوں کی محدود مدت کے لیے تھی۔

جو حدیث بھی قرآن کے نص اور روح کے خلاف ہو وہ خود بخود باطل ہو جاتی ہے۔
دلیلِ ظنی جب دلیل قطعی سے ٹکرائے تو وہ ساقط ہی ہو گی۔

مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی حضرت کعبؓ احبار سے ایک روایت منقول ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا اور اس کی بہت سی چیزوں کو سات دنوں میں تخلیق فرمایا، جبکہ قرآن کریم میں صاف آیا ہے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو چھ دنوں میں تخلیق فرمایا۔

ظاہر ہے یہ حضرت کعبؓ احبار کا قول ہو سکتا ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا نہیں کیونکہ آپؐ کا قول تو قرآنی آیات کی شرح وتفسیر کرتا ہے نہ کہ ان کی مخالفت۔

علمائے حدیث نے اسی بنیاد پر اس حدیث کو صحیح نہیں تسلیم کیا۔

بہر حال سنّت دین کا دوسرا ماخذ ہے۔ البتہ اس کی سند اور متن کو اچھی طرح پہچاننے والوں کی ضرورت ہے۔ جو سنّت سے پہلے _____ اور بعد میں بھی _____ قرآن کریم کے معانی و مقاصد کو پہچانیں۔

اجتہاد

جو شخص وحی کے ماحول میں رہتا ہو، اس کی حکمت اور احکام کا ماہر ہو، اس کی تلاوت اور اس پر غور و خوض میں منہمک رہتا ہو، اس کے سیاق و سباق اور مقاصد کی بصیرت رکھتا ہو۔ پھر جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے گہری واقفیت رکھتا ہو، آپ کے تقویٰ و عبادت، اخلاق و کردار اور اقوال و افعال سے اتنا زیادہ آگاہ ہو کہ آپ کی سنت کو مذکورہ چیزوں سے مستنبط کر سکے۔

ایسا شخص پاکیزہ و متقی دل اور طاقتور بصیرت کے ساتھ زندگی کے حالات کو سمجھ کر انھیں دین کے رنگ میں رنگنے کی صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ وہ کتاب و سنّت کے علم کے مطابق اسلامی مقاصد کے ساتھ انھیں ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرے گا اور اسی سانچے میں انھیں ڈھالنے کا خواہاں ہوگا۔

تغیر پذیر امور کو شریعت کے اصولوں اور طریقوں کے مطابق تطبیق دینے کا نام ہی اجتہاد یا قیاس ہے، اور یہ شریعت کے اصولوں اور دلیلوں میں ہے جن سے احکام جانے جاتے ہیں۔

جب تک نئے نئے حالات اور واقعات پیش آتے رہیں گے امّت اس راستے پر چلتی رہے گی۔

البتہ یہ بڑا کام ہر انسان کے بس کا نہیں، عوام کا مزاج نہ اس کی صلاحیت رکھتا ہے نہ ان کی بات مانی ہی جا سکتی ہے اسی لیے فقہ کا وجود رونما ہوا۔

نا معلوم احکام کو معلوم احکام سے مطابقت دینا مطالعہ و استعداد چاہتا ہے جس میں

یہ صلاحیت پائی جائے اسے اس کا اہل قرار دیا جائے گا ورنہ نہیں۔

قاہرہ یونیورسٹی میں اسلامی شریعت کے سابق استاد پروفیسر علی حسب اللہ لکھتے ہیں:

"امت کے لیے (قانون کا) تیسرا ماخذ اجتہاد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (النساء۔ ۵۹)	اے ایمان والو! حکم مانو اللہ اور رسول کا اور تم میں سے جو حاکم ہوں ان کا۔ پھر اگر کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہو۔
وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ (النساء۔ ۸۳)	اور جب ان کے پاس امن کی یا ڈر کی کوئی چیز پہنچتی ہے تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اگر اس کو رسول تک اور اپنے حاکموں تک پہنچا دیتے تو جو ان میں تحقیق کرنے والے ہیں اس کو تحقیق کرتے۔

گویا کتاب و سنت کے بعد اجتہاد سے بھی احکام مستنبط کیے جاتے ہیں۔ اس کی تائید حضرت معاذؓ بن جبل کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ:

"جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انھیں یمن بھیجا تو فرمایا:
اگر کوئی معاملہ درپیش ہوا تو کیا کرو گے؟
عرض کیا: کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔
فرمایا: اگر کتاب اللہ میں نہ ہوا تو؟
عرض کیا: تب سنت رسولؐ کے مطابق۔
فرمایا: اور اگر سنت رسولؐ میں بھی نہ ہوا تو؟
عرض کیا: تب اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔
تب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خوش ہو کر فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے ایلچی کو اس بات کی توفیق بخشی جو اس کے رسول کو پسند ہے۔"

حضرت سعیدؒ بن مسیب حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

یارسول اللہ! ہمیں اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کے بارے میں نہ قرآن کریم میں کوئی آیت نازل ہوئی ہو اور نہ آپؐ کی کوئی سنت ہو؟

آپؐ نے فرمایا: مومنین میں سے اہلِ علم کو اکٹھا کرو اور باہم مشورہ سے معاملہ طے کرو۔ ایک آدمی کی رائے سے فیصلہ نہ کرو۔

ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد کی دو قسمیں ہیں۔

جن معاملات میں ایک فرد کے اجتہاد سے حکم معلوم ہونا کافی ہو ان میں انفرادی اجتہاد، جیسا کہ حضرت معاذؓ کی روایت میں ہے۔

اور جن معاملات میں (وسیع پیمانے پر) تبادلۂ خیال کی ضرورت ہو ان میں علمائے امت کا (مشترکہ) اجتہاد۔ جیسا کہ حضرت علیؓ کی روایت میں ہے۔

اجماع

شریعت میں کچھ حقائق مسلمہ ہیں ان کے سمجھنے اور ان پر عمل کرنے میں صدیوں کے دوران کبھی اختلاف رائے نہیں ہوا۔ ان میں زیادتی یا کمی کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان مسلمہ حقائق کے بارے میں اختلاف و شک پیدا کرنے کی کوشش زبردست فتنہ اور برائی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

یہی اجماع کا مفہوم اور اجماع کی مخالفت میں مضمر برائی کا راز ہے۔

جن معاملات میں صریح نص نہیں ہے اور عقلاً ان کے تعلق سے متعدد صورتیں ممکن نظر آتی ہیں لیکن مسلمان کسی ایک بات یا عمل پر اتفاق رائے کر چکے ہیں تو پھر اس کی مخالفت اسلام اور امت کی مخالفت قرار پائے گی۔

مثلاً نماز کو لیجیے۔

فرض نمازیں پانچ ہیں اور ان کی رکعتیں مجموعی طور پر سترہ ہیں۔ ان کی ادائگی کا طریقہ اور ہیئت بھی سب کو معلوم ہے۔

اب ان مسلمہ باتوں میں اختلاف رائے کرنا اجماع کی مخالفت اور کفر کی طرف لے جانے والا ہوگا۔

اسی طرح روزے میں مطلع فجر سے غروب آفتاب تک کھانا پینا یا جنسی خواہش پوری کرنا منع ہے۔ اب جو اس کے برعکس کوئی بات کہے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ نیز مسلمانوں کی جماعت پر جھوٹ باندھتا ہے۔

ان متفق علیہ چیزوں کے بارے میں کسی شخص کا از سر نو غور و خوض کرنا اور نئی بات پیدا کرنے کی کوشش کرنا سوائے لغویت کے کچھ نہیں ہو سکتا۔

فقہ اور معاشرہ

ہماری روایتی تہذیب میں فقہ کا مطالعہ انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔
اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں، کیونکہ فقہ کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں وہ سارے افعال آجاتے ہیں جن کا اہلِ ایمان کو مکلّف بنایا گیا ہے۔ پھر اس میدان میں اسلامی قوانین و احکام جامع حد تک پہنچ چکے ہیں اور یہ جامعیت اسلام کی امتیازی خصوصیات میں ہے۔

جو دین ایسی امت تشکیل دے رہا ہو جو ایک دوامی پیغام کی علمبردار ہو اور جس کی صلاحیتیں اس کی تعلیمات میں مضمر ہوں وہ خاص یا عام طرزِ عمل میں کوئی خلا نہیں چھوڑ سکتا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ پر شروع ہی سے ہر چیز میں قانونی طرزِ فکر کی چھاپ رہی ہے اور اسلامی تعلیمات اس کے نظام میں شروع سے آخر تک دخل انداز ہیں۔
وہ کیسے کھائے اور کیا کھائے؟
کیسے استنجا کرے اور کیسے طہارت حاصل کرے؟
کیسے صلح و امن قائم کرے، کیسے جنگ کرے؟
بین الاقوامی تعلقات کے میدان میں عالمی خاندان کے ممبروں کے ساتھ کیسے بقائے باہم کرے؟ وغیرہ وغیرہ

پھر ان معاملات کو غیر اہم سمجھ کر ترک بھی نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ان کے بارے میں

معلومات حاصل کرنا عین دین اور کتاب وسنّت پر عمل کا حصّہ تھا۔

اسی لیے جب زوال وپسماندگی کے دور میں اسلامی تہذیب انحطاط کا شکار ہوئی تو مختلف عظیم علوم ومعارف ہمارے ہاتھ سے نکل گئے۔

وہ اہم کائناتی، معنوی وادبی اور فنّی علوم جو اسلامی راجدھانیوں میں پروان چڑھ رہے تھے دھیرے دھیرے معدوم ہوتے چلے گئے۔

عوام نے ان کی حیثیت ثانوی اور ذیلی سمجھی اس لیے انھیں کھونے کا احساس بھی نہیں ہوا۔

لیکن فقہ اپنی جگہ مستحکم بنیادوں پر جمی رہی۔

تیس سال پہلے بھی ہم دینی درسگاہوں میں فقہ کے ایسے ابواب پڑھتے تھے جن میں وضو وغسل کے طریقوں کے ساتھ امن وجنگ کے معاہدوں وغیرہ جیسے بین الاقوامی قانونی موضوعات شامل تھے

فقہ کی کتابوں میں مسائل واحکام کا یہ زبردست ذخیرہ ہمیں فقہاء کی گہری نظر، اور زندگی اور سیاست کے میدانوں میں زبردست مہارت کا ثبوت فراہم کرتا ہے کسی دوسری تہذیب میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

فقہِ عبادات

عبادات سے متعلق فقہ کے بحرِ ذخار کے بعض گوشوں پر سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادات کے تعلق سے تمام شرعی احکام اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آئے ہیں۔ انسان کا کام بس ان احکام کا نفاذ ہے اسے خود کوئی چیز تجویز کرنے یا ایجاد کرنے کا حق نہیں۔

اسلام نے جو عبادات فرض کی ہیں ان کی حیثیت مبہم رسموں کی نہیں بلکہ وہ سمجھ میں آنے والے واضح اعمال ہیں۔

تمام عبادات کو ترقی یافتہ فلسفہ اور بہترین نفسیاتی علاج قرار دیا جاسکتا ہے۔ البتہ حجاجِ کرام جو دینی مناسک ادا کرتے ہیں ان کا تعلق تاریخی یادگاروں اور جذباتی احساسات سے ہے جن سے انسان بے نیاز نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ جو مادی نظام صرف عقل کو قابلِ احترام مانتے ہیں وہ بھی ان سے خالی نہیں۔

اعلیٰ مفاہیم و مقاصد کے ساتھ عوام کو مربوط کرنے میں ان کی حکمت ظاہر و نمایاں ہے۔ اسلامی عبادات کا محور تزکیۂ نفس، اخلاصِ نیت، انسانی طبیعت میں صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خشوع و خضوع کے جذبات پیدا کرنا اور پھر زندگی اور انسانوں کے ساتھ پاکیزہ جذبہ کے ساتھ معاملہ و سلوک کرنا ہے۔

بنی آدم اس دنیا کے سردار ہیں اور عام حقوق و فرائض میں انھیں اپنے پروردگار کے سامنے عمل کرکے دکھانا ہے۔

کوئی مذہبی رہنما یا سیاسی لیڈر بھی اس معاملے میں دوسروں کے مقابلے میں کوئی امتیاز نہیں رکھتا۔ عوام کی طرح خواص کی نجات کا دارو مدار بھی اللہ تعالیٰ سے بہترین تعلق اور اخلاصِ نیت و حسنِ عمل پر ہے۔

اختلافِ رائے کے اسباب

عبادات کے تعلق سے اجتہاد کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا کو جاننے کی کوشش کی جائے کسی بھی فقیہ کی ایسی کوئی ذاتی رائے نہیں ہے جس کی پیروی کو وہ ناگزیر سمجھتا ہو۔

فقہی مسالک کے ایک مقلد کا یہ ٹھوس جواب مجھے بہت پسند آیا۔
اس سے دریافت کیا گیا کہ: کیا تم امام ابوحنیفہؒ کی بات کی پیروی کرتے ہو؟
اس نے جواب دیا: نہیں! میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات کی پیروی کرتا ہوں اس تشریح کے مطابق جو امام ابوحنیفہؒ نے کی ہے۔

تقلید کے سلسلہ میں یہ جواب سچی تصویر پیش کرتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ یا دوسرے ائمہ کی ذاتی پیروی نہیں کی جاتی۔

یہاں مسلکی تقلید ــــ جو آج کل مسلم ممالک میں رائج ہے ــــ کی تائید کرنا مقصد نہیں صرف ایک نقطۂ نظر کو پیش کرنا مقصود ہے۔

عبادات کے تعلق سے اجتہاد کے کچھ اسباب اور ان کے نتائج کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جس نص کے ثبوت کے بارے میں کوئی اختلاف رائے نہیں، سمجھنے والے اپنے ذہنی مزاج یا الفاظ کے لغوی مزاج کے اعتبار سے اس کو سمجھنے میں کبھی مختلف رایوں تک پہنچ جاتے ہیں۔

اسی طرح احادیثِ نبویہ کی سند (یعنی راویوں) کے بارے میں مختلف علماء کی رائیں

پھر اس کے نتیجے میں احکام کے استنباط میں اختلافِ رائے پیدا ہو جاتا ہے۔
مثلاً کیا عورت نماز کی امامت کر سکتی ہے؟
بعض لوگوں کی رائے میں مطلقاً نہیں کر سکتی، بعض لوگوں کی رائے میں مطلقاً کر سکتی ہے اور بعض لوگوں کی رائے میں صرف عورتوں کی امامت کر سکتی ہے۔
اور یہ کسی خاص نظریہ کو ترجیح دینے کی بنا پر نہیں بلکہ اس بنیاد پر ہے کہ مجتہد کے نزدیک سنتِ رسولؐ سے صحیح طور پر کیا ثابت ہے؟
اسی بنا پر بہت سے مسائل میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے۔
یعنی مروی احادیث کے مراتب قائم کرنے میں اختلافِ رائے کی وجہ سے راویوں کو مستند یا غیر مستند ماننے اور پھر سندوں کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کے قابلِ احترام علمی اصولوں کی بنیاد پر اگر اختلاف رائے پیدا ہوتا ہے تو گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات بھی نہیں۔

پروفیسر محمد تقی قمی جو اسلامی ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی دعوت کے علمبردار ہیں لکھتے ہیں:
"شیعہ بھی سنیوں سے اس بات میں اختلاف رائے نہیں رکھتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کی جائے۔ تمام مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ سنت اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ ہے اور یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل ماننا ناگزیر ہے۔ فرق یہ ہے کہ رسالت کے دور میں مسلمان براہِ راست رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا قول سنتے تھے یا عمل دیکھتے تھے اور بعد کے لوگوں کو سنت راویوں کے واسطوں سے پہنچتی ہے۔ اور یہیں روایت کی صحت کو پرکھنے کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور اس میں اختلافِ رائے ہوتا ہے، گویا اختلاف سنت کے بارے میں نہیں بلکہ سنت کی سند کے بارے میں ہوتا ہے، اور ایسا ہی اختلاف کبھی شیعوں اور سنیوں کے درمیان بھی ہوتا ہے۔
علمائے منطق کی اصطلاح میں اسے صغروی اختلاف کہہ سکتے ہیں یعنی جو کلامِ رسولؐ ہے تمام فرقوں کے نزدیک اس کی پیروی واجب ہے۔ اختلافِ رائے صرف سندِ روایت

یعنی اس میں ہوتا ہے کہ وہ کلام رسولؐ سے ثابت ہے یا نہیں۔

جس طرح سند اور رسول اللہؐ سے نسبت کی درجہ بندی میں اختلاف رائے ہوتا ہے اسی طرح کسی مسلمہ نص کے سمجھنے کے تعلق سے بھی اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔

مثلاً پروفیسر محمد جواد مغنیت اس آیت کے بارے میں؛

وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ	اور اگر تم میں کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں
اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ	سے کوئی جائے ضرور سے آیا ہو یا عورتوں کو چھوا
النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا	ہو پھر پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرو اور اس
صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِکُمْ	سے اپنے منہ اور ہاتھ مل لو۔
وَاَیْدِیْکُمْ۔ (المائدہ ۵ - ۶)	

لکھتے ہیں کہ: احکام والی آیات میں اس آیت سے زیادہ کسی اور کے تعلق سے مختلف اقوال نہیں ملتے۔

اس میں بھی اختلاف رائے ہے کہ تیمم کس پر واجب ہوگا کیا صرف مریض اور مسافر پر یا جسے بھی پانی نہ ملے۔

لمس سے مراد جماع ہے یا صرف ہاتھ سے چھونا بھی ہے۔

پانی سے مراد مطلقاً پانی ہی ہے یا پانی میں کوئی چیز ملی ہوئی ہو تو بھی اس تعریف میں آئے گا۔

صعید سے مراد صرف مٹی ہے یا ریت اور پتھر وغیرہ دیگر زمینی چیزیں بھی۔ چہرے سے مراد پورا چہرہ ہے یا اس کا کوئی حصہ۔

ہاتھ سے مراد ہتھیلی ہے یا بازو بھی۔

امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ مسافر و مریض کو اگر پانی نہ ملے تو ان پر تیمم واجب ہوگا مقیم اور صحتمند کے لیے پانی نہ ملنے پر بھی تیمم نہیں ہے (المغنی لابن قدامہ و بدایۃ المجتہد) ان کی دلیل یہ ہے کہ آیت میں صرف پانی نہ ملنے کا ذکر نہیں بلکہ ساتھ میں سفر یا مرض کی شرط بھی ہے۔

دیگر سارے مسالک میں پانی نہ ملنے پر تیمم و نماز واجب ہوگی چاہے مسافر ہو یا مقیم اور چاہے مریض ہو یا تندرست، کیونکہ حدیث سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

شافعی مسلک میں لمس سے مُراد ہاتھ سے چھونا بھی ہے۔ البتہ غیر عورت کو بغیر کسی درمیانی چیز کے براہِ راست چھونا مُراد ہے۔

امامی مسلک میں لَمس سے مراد جماع ہے کیونکہ عرب لمس سے مراد جماع ہی لیتے ہیں حنفی اور امامی مسلک میں صعید سے مراد مٹی، ریت اور پتھر ہے البتہ معدنیات اس میں شامل نہیں۔ شافعی مسلک میں صرف مٹی اور ریت مُراد لی جاتی ہے۔ پتھر نہیں۔ حنبلی مسلک میں اور بعض امامیوں کے نزدیک صرف مٹی مراد ہے۔ مالکی مسلک میں اس سے مراد مٹی کے ساتھ ریت، پتھر، برف اور معدنیات بھی لیتے ہیں اگر انھیں ان کی اصل جگہ سے ہٹایا نہ گیا ہو البتہ سونا، چاندی اور جواہرات شامل نہیں۔

ائمہ اربعہ کے نزدیک چہرے سے مراد پورا چہرہ ہے جیسا کہ وضو میں جبکہ امامی مسلک میں چہرے کا جز مراد ہے۔

ائمہ اربعہ کے نزدیک ہاتھوں سے مراد وضو کی طرح ہتھیلیوں سے لے کر کہنیوں تک ہے جبکہ امامی مسلک میں صرف ہتھیلیاں مراد ہیں۔

ابن رشد کہتے ہیں کہ ہاتھ سے مراد کلامِ عرب میں کبھی صرف ہتھیلی لی جاتی ہے کبھی ہتھیلی اور کہنیوں تک اور کبھی بازو تک بھی۔

الغرض ان اقوال سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلکوں کے درمیان اختلاف رائے معنوی نہیں لفظی نوعیت کا ہے اور وہ بھی بنیادی اصولوں میں نہیں بلکہ فروعات میں۔ وہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت میں کتنی لچک اور اجتہاد کرنے اور آسانی پیدا کرنے کی کتنی زبردست گنجائش پائی جاتی ہے۔"

○

اب کیا ان مذہبی مسلکوں میں کسی ایک کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ حق پر سمجھا جاسکتا ہے؟ نہیں، اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔

اب یا تو آپ سب کو حق کی مختلف صورتیں اور صحیح سمجھیں۔

یا پھر یہ سمجھ لیں کہ کسی مسئلے میں حق پران میں سے کوئی ایک ہو سکتا ہے لیکن اس کی تعیین نہیں کی جا سکتی۔ حق کو واضح کرنے کے لیے ہی مجتہدین نے استنباط کرنے کی کوششیں کی ہیں اور ان کوششوں کا اجر ان سب کو ملے گا۔

جو غلط نتیجے تک پہنچا اسے بھی اپنی کوشش کا اجر ملے گا۔

اور جو صحیح نتیجے تک پہنچا ـــــ اور ہم متعین طور پر یہ نہیں جان سکتے کہ کون پہنچا۔ اسے بھی اجر ملے گا اور دگنا ملے گا۔

ان میں سے کسی کو بُرا سمجھنے یا گمراہ قرار دینے کی کوئی گنجائش نہیں۔

نہ یہ ماننے کی گنجائش ہے کہ بس وہی حق ہے اور اس کے سوا حق نہیں۔

پہلے کے مجتہدین اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے اسی لیے ان میں سے ہر ایک نے دوسرے پر نکتہ چینی کرنے یا اسے اپنی رائے ماننے پر مجبور کرنے سے انکار کیا۔

خلیفہ منصور عباسی نے حج کے موقعہ پر امام مالکؒ سے کہا کہ: میرا ارادہ ہے کہ میں آپ کی کتاب (موطا) کے نسخے نقل کرا کے تمام اسلامی علاقوں میں بھجوا دوں اور یہ حکم جاری کر دوں کہ بس اسی کے مطابق عمل کیا جائے، امام مالکؒ نے کہا امیر المومنین! ایسا مت کیجیے (مختلف علاقوں کے) لوگوں تک بہت سی احادیث پہلے سے پہنچ چکی ہیں اور وہ ان کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔ جہاں کے لوگوں نے اپنے لیے جو کچھ اختیار کر لیا ہے انھیں اسی پر عمل کرنے دیجیے۔

میری رائے میں فقہی مسالک میں رائج بیشتر اقوال حق ہیں اور ان کی بنیاد زمان ومکان کے فرق ومناسبت کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قول وعمل پر ہے۔

آپ نے کبھی نماز میں ہاتھ باندھے، کبھی چھوڑے رکھے۔

کبھی رکوع سے پہلے اور بعد میں ہاتھ اٹھائے، کبھی نہیں اٹھائے۔

اقامت میں تکبیر کے کلمات ایک ایک بار بھی کہنے دیے اور دو دو بار بھی۔

اور ان باتوں سے وہ تنگی ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی جو آج تنگ نظری اور جہالت کی وجہ سے پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔

کچھ بنیادی اصول ہیں جن کے تعلق سے اہلِ ایمان میں کوئی اختلافِ رائے نہیں پایا جاتا۔ اگر ہم ان پر عمل کرتے رہیں تو پھر معمولی باتوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے۔ استاد محمد تقی قی لکھتے ہیں:

"کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ وہ بنیادی اصول کیا ہیں جنھیں مسلمانوں اور دیگر لوگوں کے درمیان حدِ فاصل مانا جا سکے۔

تو ہم مثال کے طور پر بتا سکتے ہیں کہ ہم سب اللہ تعالیٰ کو پروردگار مانتے ہیں۔ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو نبی و رسول مانتے ہیں۔ قرآن کو کتابِ الٰہی مانتے ہیں، کعبہ کو قبلہ مانتے ہیں۔ یہ مانتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد توحید و رسالت، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ پر ایمان پر ہے اور یہ کہ اسلام اللہ کا آخری دین ہے اور حضرت محمدؐ آخری رسول ہیں۔ حضرت محمدؐ جو کچھ لے کر مبعوث ہوئے وہ حق ہے، قیامت حق ہے، پھر سے اٹھایا جانا حق ہے آخرت میں جزا ملنا حق ہے، جنت حق ہے اور جہنم حق ہے وغیرہ۔ اور جس چیز میں اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول پر ہے۔

یعنی ہم اختلافِ رائے کے طریقے پر متفق ہیں، ہم میں سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ: یہ حکم اللہ یا اس کے رسولؐ نے دیا ہے پھر بھی ہم نہیں مانتے۔

یا کوئی یہ نہیں کہتا کہ: اللہ اور اس کے رسولؐ نے فلاں چیز پر ایمان لانے کا ہمیں مکلف بنایا ہے پھر بھی ہم اس پر ایمان نہیں رکھتے۔

نہ کوئی دین کی کسی ضروری بات کا انکار کرتا ہے۔

اختلافِ رائے کرنے والے صرف اس میں اختلافِ رائے کرتے ہیں کہ فلاں چیز کا حکم اللہ اور اس کے رسولؐ نے دیا ہے یا نہیں یا فلاں چیز میں اجتہاد کی گنجائش ہے یا نہیں۔

گویا اختلافِ رائے اس پر ہوتا ہے کہ فلاں چیز کا حکم اللہ اور اس کے رسول سے ثابت ہے، یا نہیں۔ جبکہ یہ بالاتفاق تسلیم کیا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت ہر مسلمان پر واجب ہے اور شریعت الٰہی کا مرجع و ماخذ قرآن و سنت ہی ہیں۔"

معاملات

دین کی آمد سے پہلے بھی لوگ باہم معاملات کیا کرتے تھے۔
معنوی و مادی ربط کی بہت سی صورتیں ان انسانی ضروریات میں سے ہیں جو آسمانی ہدایت پر منحصر نہیں ہیں۔
اسلام کی آمد سے پہلے اور ان علاقوں میں جہاں اسلام نہیں پہنچ سکا، لوگوں کے درمیان اقتصادی، سماجی اور سیاسی تعلقات رہے ہیں وحی کا کام یہ ہوا کہ ان معاملات کو آلائشوں سے پاک صاف کر دے اور انھیں اپنے اصولوں اور مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ کر دے۔ اگر وہ معاملات پہلے ہی سے درست تھے تو ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی انھیں ویسے ہی برقرار رہنے دیا گیا۔
مثلاً سامان کی فروخت ایک عام معاملہ ہے۔ اسلام نے صرف یہ چاہا کہ اسے ملاوٹ، فریب دہی اور سود وغیرہ سے پاک کر دے۔
معاملات میں خرابی خود پسندی، مفاد پرستی اور بدنیتی وغیرہ سے پیدا ہوتی ہے اسی لیے اسلام نے معاملات میں مصلحتِ عامہ اور انصاف کی رعایت کو بنیادی اہمیت دی ہے اور مصلحتِ عامہ و انصاف کے قیام و تحفظ ہی کو معاملات سے متعلق تمام تصرفات کی بنیاد قرار دیا ہے ان اصولوں کو عملی تطبیق بھی دی ہے۔ محض قانون کے اصول و اغراض کے نظریاتی و فنی مطالعے تک محدود نہیں رکھا ہے۔
قانون کا مزاج خشک ہوتا ہے لیکن شریعت کے احکام روح، دل اور جذبات

کو بھی اپیل کرتے ہیں۔

آپ اگر جائزہ لیں کہ اسلام لوگوں کے معاملات میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے تو آپ کو صاف نظر آجائے گا کہ وہ ان میں کس طرح اپنے آسمانی مزاج کی رُوح پھونک دیتا ہے۔ وہ خشک قانونی عبارتوں کو اخلاق و ادب کی نصیحتوں اور ہدایتوں میں ڈھال دیتا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ معاملات کا انحصار مصلحتِ عامہ پر رکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو کچھ لوگ ماننا چاہیں اسے نیک عمل قرار دے دیا جائے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ اسلام نے جس چیز کو حرام قرار دے دیا ہے جیسے سود یا زنا، اسے انسانی مفاد و مصلحت کی چیز نہیں تسلیم کیا جاسکتا۔

اسی طرح دونوں فریقوں کی رضامندی بھی ان برائیوں کو جائز نہیں بنا سکتی چاہے تمام دنیاوی قوانین اسے جائز قرار دینے لگیں۔

یہ بات پہلے کہی جا چکی ہے کہ دینی احکام معاشرے کے پورے وجود کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور اس کا کوئی پہلو نہیں چھوڑتے، یہاں سارے پہلوؤں کا ذکر کرنا تو ممکن نہیں تاہم ہم دو پہلوؤں کا ذکر کریں گے جن سے سارے معاملات میں اسلامی چھاپ اور رنگ کی نوعیت واضح ہوجائے گی۔

کچھ معاملات خرید و فروخت، لین دین، رہن اور قرض وغیرہ کاروباری امور سے متعلق ہوتے ہیں اور کچھ معاملات جنگ و امن، دعوت، قبول و انکار اور صلح وغیرہ سیاسی امور سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں قسم کے معاملات کے سلسلے میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے بازار میں بیچنے کے لیے کوئی سامان رکھا اور اس کے بیچنے کے سلسلے میں قسم کھائی تو یہ آیت نازل ہوئی:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ	جو لوگ اللہ کے قرار پر اور اپنی قسموں پر تھوڑا سا
وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا	مول لے لیتے ہیں ان کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں
خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا	قیامت کے دن ان سے نہ اللہ بات کرے گا

يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (آل عمران۔ ۷۷)
اور نہ ان کی طرف نگاہ کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس سے گزرے جو کوئی غذائی جنس بیچ رہا تھا آپؐ نے اس سے دام پوچھے اس نے بتا دیے۔ آپؐ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالا تو اسے پانی سے نم پایا۔ آپؐ نے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ بارش کا پانی پڑ گیا ہے آپؐ نے فرمایا تو اسے اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ سکتے؟ پھر آپؐ نے فرمایا جس نے فریب کاری کی وہ ہم میں سے نہیں۔ (ابو داؤد و مسلم)

حضرت حکیم بن حزامؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
" خرید و فروخت کرنے والے جب تک الگ نہ ہو جائیں انھیں (سودا منسوخ کرنے کا) اختیار باقی رہتا ہے۔ اگر دونوں سچائی سے کام لیں گے تو ان کے سودے میں برکت ہوگی۔ اور اگر جھوٹ بولیں گے اور چھپائیں گے تو اس کی برکت مٹا دی جائے گی۔" (بخاری)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باہر (دیہاتوں سے) سودا لے کر پہنچنے آنے والے سواروں سے (شہر کے باہر ہی) نہ ملو اور نہ کوئی شہری کسی دیہاتی کے لیے بیچے (یعنی دلالی نہ کرے) (مسلم)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایسا سخت زمانہ آئے گا جب خوشحال لوگ اپنی دولت سمیٹے رہیں گے جبکہ انھیں اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ (البقرہ۔ ۲۳۷) اور آپس میں احسان کرنا نہ بھلادو۔

اسی طرح مجبوری کی حالت میں خریداری ہوگی جبکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجبور آدمی کی طرف سے فروخت کو منع فرمایا ہے۔ (ابو داؤد)

یعنی کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر یا اسے مجبور کر کے اس کا سامان کم قیمت پر نہ لیا جائے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے

کھلانے والے اس کی دستاویز لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی اور فرمایا کہ وہ سب برابر ہیں۔ (مسلم)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں رواج یہ تھا کہ کھجور کی فصلیں ایک ایک دو دو سال پہلے سے بیچ دی جاتی تھیں آپ نے ہدایت دی کہ مقررہ وزن، مقررہ قیمت اور مقرّرہ مدّت کے ساتھ سودا کیا جائے۔ (ابو داؤد)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں دو شریکوں کے درمیان تیسرا رہتا ہوں جب تک ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے خیانت نہ کرے۔ جب خیانت کر لیتا ہے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں۔" (ابو داؤد)

حضرت عروہ بارقیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انھیں قربانی کا جانور یا بکری خریدنے کے لیے ایک دینار دیا۔ انھوں نے اس سے دو بکریاں خریدیں پھر ایک بکری ایک دینار کی بیچ دی اور ایک بکری اور ایک دینار لے لیے آپ نے ان کے لیے کاروبار میں برکت کی دُعا فرمائی۔ پھر یہ حال ہو گیا کہ اگر وہ مٹی بھی خرید لیتے تو فائدہ ہو جاتا۔ (ابو داؤد)

حضرت عمر بن عوف مزنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"مسلمانوں کے درمیان سمجھوتہ جائز ہے جب تک کہ اس سے کوئی حرام چیز حلال یا حلال چیز حرام نہ ہو جائے۔ اور مسلمانوں کی شرطیں برقرار رہیں گی جب تک کسی شرط سے حلال چیز حرام یا حرام چیز حلال نہ ہو جائے۔" (ترمذی)



حضرت عطار بن یسارؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو کسی مہم پر بھیجا اور فرمایا کہ جاؤ اور کسی طرف متوجہ نہ ہونا۔ انھوں نے دریافت

کیا: یارسول اللہ! ان کے ساتھ کس طرح پیش آؤں گا؟ آپؐ نے فرمایا جب ان کے علاقہ میں پہنچ جاؤ تو اس وقت تک جنگ نہ کرنا جب تک وہ تمہارے کسی آدمی کو قتل نہ کر دیں۔ اور اگر کسی کو قتل کر دیں تب بھی اس وقت تک جنگ نہ کرنا جب تک انھیں مقتول کو دکھا نہ لو پھر ان سے کہنا کہ کیا تم لوگ کلمۂ شہادت پڑھتے ہو؟ اگر وہ ہاں کہیں تو کہنا کیا تم نماز پڑھو گے؟ اگر وہ کہیں ہاں تو کہنا کیا تم اپنے مال کا صدقہ نکالو گے اگر وہ کہیں ہاں تو پھر اس سے زیادہ کچھ اور مت طلب کرنا۔ خدا کی قسم تمہارے ہاتھوں ایک آدمی ہدایت پا جائے یہ تمہارے لیے ہر چیز سے بہتر ہے۔ (احمد)

حضرت عبدالرحمٰن بن عائذؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب کوئی لشکر بھیجتے تھے تو فرماتے تھے:

لوگوں کے ساتھ انسیت والفت سے پیش آنا، جب تک انھیں دعوت نہ دے لو حملہ نہ کرنا۔ کوئی ایک گھر بھی تمہارے ہاتھوں مسلمان ہو جائے یہ مجھے اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ تم ان کے مردوں کو قتل کر دو یا عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر لاؤ۔

(تیسیر الاصول)

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت یزیدؓ بن ابوسفیان کو ایک لشکر کا سردار بنا کر بھیجتے ہوئے دس باتوں کی نصیحت فرمائی، ان میں یہ باتیں بھی تھیں کہ خانقاہوں میں گوشہ نشین راہبوں کو نہ مارنا، کسی بچے، عورت کو اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، کسی پھل دار درخت کو نہ کاٹنا اور کھانے کی ضرورت کے علاوہ کسی مویشی کو ذبح نہ کرنا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایک آدمی دنیاوی فائدے کے لیے جہاد کرنا چاہتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اس کے لیے کوئی اجر نہیں۔ یہ بات لوگوں کو بھاری لگی انھوں نے اس شخص کو پھر بھیجا کہ شاید تم اپنی بات رسول اللہؐ پر واضح نہ کر سکے ہو۔ وہ آیا اور عرض کیا یارسول اللہ ایک آدمی اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے لیکن دنیاوی فائدہ بھی چاہتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اسے کوئی اجر نہیں ملے گا۔ لوگوں نے

تیسری بار پھر اسے بھیجا اور اس نے وہی سوال دریافت کیا آپؐ نے پھر وہی جواب دیا کہ اسے کوئی اجر نہیں ملے گا۔ (ابو داؤد)

مسلمانوں کے ایک لشکر نے ایران کے محل کا محاصرہ کیا۔ لشکر کے سردار حضرت سلمان رضؓ فارسی تھے لوگوں نے کہا کیا حملہ نہیں کریں گے؟ انھوں نے کہا پہلے مجھے انھیں دعوت دینے دو جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دعوت دیتے تھے۔ چنانچہ وہ گئے اور کہا میں تمہیں میں سے ایک آدمی یعنی ایرانی ہوں۔ عرب میری اطاعت کرتے ہیں اگر تم اسلام قبول کرلو تو تمہارے حقوق اور ذمّے داریاں بھی وہی ہوجائیں گی جو ہماری ہیں یا پھر جزیہ دینا مان لو ورنہ پھر مقابلہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ہم مقابلہ کریں گے۔ حضرت سلمانؓ تین روز تک انھیں دعوت دیتے رہے پھر جنگ شروع کرنے کی اجازت دی۔ (جبکہ ایران کے ساتھ حالتِ جنگ جاری تھی)

حضرت معاویہؓ اور رومیوں کے درمیان ایک معاہدہ تھا جب اس کی مدّت ختم ہوگئی تو انھوں نے حملہ کردیا ایک شخص گھوڑے پر سوار آیا اور کہنے لگا "وفاداری کرو غدّاری نہیں۔ وہ حضرت عمروؓ بن عنبسہ تھے۔ حضرت معاویہؓ نے ان سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس کا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو وہ اسے ختم نہ کرے۔ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہم غزوۂ خیبر کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے آپؐ نے وادی القریٰ کا رُخ کیا۔ آپ کو ایک سیاہ فام غلام ہدیۃً ملا تھا جس کا نام مدعم تھا، وہ آپؐ کا سامان ٹھیک کر رہا تھا کہ اسے تیر لگا اور وہ مر گیا۔ لوگوں نے کہا اس کے لیے جنت کی خوشخبری ہو۔ آپؐ نے فرمایا نہیں اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے خیبر کے دن اس نے مالِ غنیمت سے جو شملہ تقسیم سے پہلے اٹھالیا تھا وہ اس پر آگ جلا رہا ہے۔ یہ سُن کر ایک آدمی جوتے کا ایک تسمہ یا دو تسمے لایا۔ آپؐ نے فرمایا یہ آگ کے تسمے تھے۔ (بخاری)

حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا اور فرمایا:

ابو مسعود جاؤ۔ قیامت کے دن مجھے اس طرح نہ ملنا کہ تمہارے پیٹھ پر زکوٰۃ کا کوئی اونٹ، جسے تم نے ہڑپ کرلیا ہو، بلبلا رہا ہو!

انھوں نے کہا: تب میں نہیں جاؤں گا۔

آپؐ نے فرمایا: تب میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔

حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"جس نے کسی ذمّی کو بلاوجہ قتل کیا اس پر اللہ تعالیٰ جنت حرام کردے گا"

ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس پر جنت کی خوشبو حرام کردے گا۔

شریعت کا مزاج

اسلام ان ہدایات سے بھرا ہوا ہے جو زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں اور ماننے والے کے لیے سلامتی واستقامت کے راستوں کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

یہاں ہر میدان میں اسلامی تعلیمات کا ذکر مقصود نہیں تاہم یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ان ہدایات کو پڑھ کر ایک شخص مختلف معاملات میں اسلام کی روح اور حکمت کو جان سکتا ہے۔

فقہاء نے ایسے قواعد اور اصول منضبط کر دیے ہیں جن سے قانونی پیچیدگیوں کو حل کیا جاسکتا ہے اور اہلِ دانش ان کی بنیاد پر زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں ہدایات فراہم کر سکتے ہیں۔

معاملات کے میدان میں رسول کریمؐ سے جو سنتیں ہمیں ملی ہیں وہ ایک زبردست قیمتی ورثہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور کسی اور سے اتنی رہنمائی نہیں مل سکی۔

آج فکری ونظریاتی یلغار کے زیر سایہ پرورش پانے والی نسل اس قیمتی ورثہ کی قدر و قیمت سے نا آشنا ہے۔

مختلف مثالوں سے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ:

—— اسلام نے کس طرح معاملات کو حسنِ نیت اور اعلیٰ مقصدیت کے ساتھ مربوط کیا۔

—— شریعت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں زندگی کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔

—— یہ واضح ہوجاتا ہے کہ سنتیں جزئی اور غیر مربوط احکام کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ بلکہ ان کے درمیان ربط ہے اور وہ ایک ہی روح کے مختلف مظاہر ہیں اور ان کا مقصد لوگوں کے حالات کو ایک نظام سے مربوط کرنا ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ لکھتے ہیں:

"یہ فطری بات ہے کہ شریعت کا مقصد تمام انسانوں کے مفاد کا تحفظ ہو نسل و مذہب کی بنیاد پر کوئی فرق و امتیاز نہ کیا جائے۔ امام شاطبیؒ کہتے ہیں کہ "ہم تمام نصوص کو پڑھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شریعت نے تمام بندوں کے مفاد کو اپنا مقصد بنایا ہے اور مفادِ عام ہی پر معاملات کے عام احکام مبنی ہیں اور مصلحتِ عامّہ کے ساتھ اس طرح کے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔

چونکہ لوگوں کی مصلحتیں باہم ٹکرا بھی سکتی ہیں یعنی ایک کی بھلائی میں دوسرے کو نقصان پہنچ سکتا ہے اس لیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ اصول بتا دیا کہ "نہ کوئی کسی کو نقصان پہنچائے نہ لوگ باہم ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں۔"

اب اس اصول کی تطبیق بہت سی صورتوں میں ہو سکتی ہے مثلاً مفادِ عامّہ کے لیے سڑک یا نہر وغیرہ کی توسیع و تعمیر کی غرض سے فرد کی ملکیت کا حق چھینا جا سکتا ہے یا مثلاً کسی محتاج رشتہ دار کا خرچ اس کے رشتے دار پر ڈالا جا سکتا ہے یا مثلاً خوشحال مقروض کو قرض کی رقم ادا کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے چاہے اسے قید ہی کرنا پڑے۔



یحییٰ بن آدم قرشی نے اپنی کتاب "الخراج" میں روایت نقل کی ہے کہ ضحاک بن خلیفہ انصاری کا ایک کھیت تھا جس میں سینچائی کے لیے پانی تبھی پہنچ سکتا تھا جب محمد مسلم کے باغ میں سے گزرے۔ محمد مسلم نے اپنے باغ سے پانی لے جانے کو منع کر دیا یعنی اپنی زمین میں نالی بنانے کی اجازت نہیں دی۔

ضحاک حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور معاملہ پیش کیا۔

حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلم سے دریافت کیا: تمہارا کوئی نقصان ہوتا ہے؟

انھوں نے کہا: نہیں۔

حضرت عمرؓ نے کہا: خدا کی قسم اگر سوائے تمہارے پیٹ کے اور کوئی دوسرا راستہ نہ ملتا تو میں اس پر سے پانی گزار دیتا۔ جاؤ، پانی جانے دو۔

اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن سے صاحب بصیرت فقہار نے اہم نتائج نکالے ہیں۔ شیخ محمد یوسف موسیٰ لکھتے ہیں :

" اسلامی فقہ حقدار کا حق محفوظ رکھتی ہے اور اسے حسب مرضی استعمال کرنے کی اجازت دیتی ہے اور دوسروں کو اس کا حق پامال کرنے کی اجازت نہیں دیتی بشرطیکہ حقدار کے اپنے حق کے استعمال سے دوسروں کو اس حد سے زیادہ نقصان نہ پہنچے جتنا حقدار کو حق کے استعمال کی آزادی حاصل ہے اور یہ اسی اصول کی بنیاد پر کہ (نہ ایک شخص دوسرے شخص کو نقصان پہنچائے نہ لوگ باہم ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں) اور یہ کہ دو نقصان دہ چیزوں میں سے کم تر نقصان دہ چیز کو اختیار کرلیا جائے۔"

شیخ علی حسب اللہ لکھتے ہیں کہ علمار نے دین کے احکام و مقاصد کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ وہ مصالح جن پر زندگی کا دار و مدار ہے، انھیں مصالحِ ضروریہ کہا جاتا ہے اور وہ پانچ چیزوں کی حفاظت سے تعلق رکھتی ہیں: دین، جان، عقل، نسل اور مال۔ احکامِ شریعت زیادہ تر انھیں سے متعلق ہیں۔

۲۔ وہ مصالح جن کے بغیر زندگی تہ و بالا تو نہیں ہوتی لیکن ان کے بغیر تنگی اور مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انھیں ضرورت والے مصالح کہا جاتا ہے بہت سے احکامِ شریعت ان سے بھی متعلق ہیں مثلاً اشیار کا تبادلہ، بعض مکلف چیزوں میں بعض اوقات چھوٹ۔

۳۔ کچھ مصالح عادات کی بہتری سے متعلق ہیں جیسے ستر پوشی اور ناپاک کھانوں کی حرمت وغیرہ، انھیں تحسینِ مصالح کہا جاتا ہے۔

شریعت کے احکام ان سارے مصالح کا تحفظ کرتے ہیں کیونکہ شریعت مکمل بھی ہے اور لوگوں کے لیے عدل، انصاف اور نرمی کی علمبردار بھی۔

اسی لیے اسلامی شریعت ہر زمان و مکان میں انسانوں کے لیے مناسب ہے۔

حکمِ الٰہی کی فوقیت

انسانوں کے لیے یہ درست ہے نہ مناسب کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو پروردگار یا حاکمِ حقیقی مان لیں جو کسی غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ حق کا انکار اور نعمت کی ناشکری کرتا ہے یہی حال اس کا بھی ہے جو اللہ کے دیے ہوئے حکم کے بجائے کسی دوسرے کا حکم مانتا ہے۔

آخر ہم کسی انسان کو یہ حق کیسے دے سکتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم دینے، منع کر دینے یا حلال و حرام ٹھہرانے کے حق میں ساجھی ہو جائے؟

کسی انسان کو یہ حق کیسے پہنچ سکتا ہے کہ وہ کلامِ الٰہی کو ایک طرف ڈال دے اور خود اپنی طرف سے احکام گھڑ لے اور پھر یہ بھی سمجھے کہ وہ اللہ کے احکام سے زیادہ پیروی کے لائق ہیں۔ کیا وہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا ہے؟

کیا اللہ تعالیٰ کو انسانوں کی جو ضرورتیں بھول گئی تھیں وہ اسے یاد آ گئی ہیں؟

الٰہی شریعت کو نظر انداز کر کے کسی انسانی شریعت کو ماننا بدترین جہالت ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا	سو کیا اب اللہ کے سوا کسی اور کو منصف بناؤں حالانکہ اس نے تم پر واضح کتاب اتاری۔

(الانعام۔ ۱۱۴)

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ۔ (الاعراف۔ ۵۴)

سن لو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم فرمانا بڑی برکت والا ہے اللہ جو سارے جہان کا رب ہے۔

بلاشبہ آسمانی شریعتوں کو بھلا دینا گناہِ عظیم ہے بلکہ اس گناہ اور دوسرے انفرادی گناہوں کے درمیان یہ فرق بھی ہے کہ افراد کسی غفلت، کمزوری یا لغزش وغیرہ کی وجہ سے انفرادی گناہوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں جبکہ آسمانی احکام کو پسِ پشت ڈالنا جان بوجھ کر، اعلانیہ طور پر اور اللہ تعالیٰ سے بے خوفی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ حق کو چھوڑ کر خواہشِ نفس کے پیچھے دوڑنے والوں کو وعید سناتا ہے:

يَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ۔ (ص۔ ۲۶)

اے داؤد ہم نے تم کو ملک میں نائب بنایا سو تم لوگوں میں انصاف سے حکومت کرو اور دل کی خواہش پر نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کی راہ سے گمراہ کر دے۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اس بات پر کہ انھوں نے حساب کا دن بھلا دیا۔

سلوک و معاملات میں تو اللہ تعالیٰ کے احکام کو نگاہوں سے اوجھل کرنا خواہشاتِ نفس کی بنیاد پر ہوتا ہے لیکن قانون سازی کے میدان میں اس دعویٰ کے ساتھ ہوتا ہے کہ منطق کا تقاضا یہی ہے یا مصلحتِ عامہ یہی چاہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ۔ (المائدۃ۔ ۴۹)

اور جو کچھ اللہ نے اُتارا اس کے مطابق ان میں حکم کرو اور ان کی خوشی پر مت چلو اور ان سے بچتے رہو کہ تمہیں بہکا نہ دیں کسی ایسے حکم سے جو اللہ نے تم پر اُتارا۔

اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ تمام لوگ اس حقیقت کو شعوری طور پر سمجھیں اور یقین کریں کہ

شریعت باطل و بیکار پر مبنی نہیں ہے بلکہ مکمّل طور پر حق ہے۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ۔ (البقرۃ۔ ۱۴۷)	حق وہی ہے جو تمہارا رب کہے پھر تم شک لانے والے نہ ہو۔
اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (یوسف۔ ۴۰)	سوائے اللہ کے کسی کی حکومت نہیں۔
لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ (القصص۔ ۸۸)	اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف پھر جاؤ گے۔

قانون انسانی زندگی کے بہت سے گوشوں کا احاطہ کر سکتا ہے لیکن اگر اس پر ایسی روحانی چھاپ نہیں جو اسے ہیبت اور احترام فراہم کرے تو اس کا اثر محدود و ناقص ہی رہے گا۔ قانون تنہا معاشرے کو تحفظ اور یقین فراہم نہیں کر سکتا۔

لیکن آسمانی شریعت ایسا کرتی ہے کیونکہ اس کو ماننا اللہ کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہوتا ہے اور ہر بڑے چھوٹے کام میں مکمل سپردگی ہی ایمان کا تقاضا ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ (النور۔ ۵۱)	ایمان والوں کی بات یہی تھی کہ جب ان میں فیصلہ کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تو کہیں کہ ہم نے سن لیا اور حکم مان لیا۔
فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء۔ ۶۵)	سو تمہارے رب کی قسم ہے کہ وہ مومن نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تم کو ہی منصف مانیں اس جھگڑے میں جو ان کے درمیان اٹھے۔ پھر تمہارے فیصلے سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور خوشی سے قبول کریں۔

اسی لیے آسمانی شریعت کا رعب و نفاذ ظاہری طور پر بھی ہوتا ہے اور باطنی طور پر بھی۔ کیونکہ اس کا نفاذ کسی ایسی طاقت کے خوف سے نہیں ہوتا جس کو دھوکا دیا جا سکے۔

بلکہ اس ذات کے ڈر سے ہوتا ہے جو ظاہر و پوشیدہ تمام چیزوں کو جانتی ہے۔

خود مجرم ہی سب سے پہلے اس کی سزا کے آگے جھک جاتا ہے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اللہ کے حکم کو ٹالا نہیں جا سکتا، بلکہ وہ کوشش کرتا ہے کہ اسے دنیا ہی میں اپنے جرم کی سزا مل جائے تاکہ آخرت کے عذاب سے بچ جائے۔

یہ آسمانی قانون کا وہ امتیازی وصف ہے جس سے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین عاری ہوتے ہیں۔

پھر اللہ کے حکم کا نفاذ ایسا فرض ہوتا ہے جس کی ادائیگی میں ریاست اور معاشرہ تعاون کرتے ہیں اور اسے اپنی ذمّے داری سمجھتے ہیں۔ اس طرح مجرم کے گرد حصار تنگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے جرم کے نتائج سے بھاگ نہیں پاتا خود اپنے قریب ترین لوگوں کے پاس بھی اسے پناہ نہیں مل سکتی کیونکہ سبھی اسے سزا کے لیے سپرد کر کے اللہ تعالیٰ سے قربت حاصل کرنے کے خواہاں ہوں گے۔

دوسری صورتوں میں مجرم کی گرفتاری کے لیے انعام تک مقرر کیے جاتے ہیں پھر بھی مجرم کو چھپانے والے مل جاتے ہیں۔ کیونکہ قانون کی حرمت دلوں کی گہرائیوں میں نہیں ہوتی بلکہ بعض لوگ تو اس کے سزا کے مستحق ہونے یا اس قانون کی افادیت ہی کے قائل نہیں ہوتے۔

یہ کتنی مشکل بات ہے کہ قانون کے نفاذ کا تعلق صرف مادّی اقتدار کے ساتھ مربوط ہو اور اگر کوئی جرم اقتدار کی پکڑ سے باہر ہو ـــــ اور ایسا کتنا زیادہ ہوتا ہے ـــــ تو قانون بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

کیا افسروں اور سپاہیوں کی فوج اس مہم کو سرانجام دے سکتی ہے؟

اور اگر ایسا ممکن بھی ہو جائے تو کیا مطلوبہ بلند معیار حاصل ہو سکتا ہے؟

اور پھر اس سلسلے میں کتنا بوجھ اٹھانا پڑے گا؟

اسلامی معاشرے میں دینی شعور حیرت انگیز نتائج پیدا کرتا ہے۔

ایک آدمی شہوت کے دباؤ میں آ کر زنا کا جرم کر لیتا ہے۔

کسی نے اسے دیکھا بھی نہیں۔

لیکن جب ہوش میں آتا ہے اور اس کا ضمیر جاگتا ہے تو خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ مجھ پر حد جاری کر دیجیے۔

آپ نے دیکھا؟ ایک مومن جب دیکھتا ہے کہ اس سے گناہ سرزد ہوگیا تو وہ اپنی ذمے داری سمجھتا ہے کہ سزا پاکر اپنے آپ کو پاک کرلے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں فرمان جاری ہوتا ہے کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے۔

حضرت عمرؓ رات میں لوگوں کا حال معلوم کرنے کے لیے گشت کرنے نکلتے ہیں تو ایک مکان سے آواز سنائی دیتی ہے۔ ماں بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ دودھ میں پانی ملا دو۔

بیٹی کہتی ہے: نہیں، امیرالمومنین نے منع کیا ہے۔

ماں کہتی ہے: امیرالمومنین کیا یہاں دیکھ رہے ہیں؟

بیٹی جواب دیتی ہے۔ اگر امیرالمومنین نہیں دیکھ رہے ہیں تو خدا تو دیکھ رہا ہے۔

ایک نوجوان عورت کو ایک شخص بُرائی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اندھیری رات ہے، مکمل تنہائی ہے۔ وہ کہتا ہے یہاں ہمیں سوائے ستاروں کے کوئی اور دیکھنے والا نہیں۔

عورت جواب دیتی ہے: اور ستاروں کا خالق کہاں ہے؟

اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والا ضمیر ہی حقیقی قانونی بالادستی کا ضامن ہے۔ جب اس انداز پر قانونی پالیسی بنے گی تو اس کی بنیادیں مضبوط ہوں گی اور تب ہی راحت محسوس کریں گے۔

قانون کا تقدس سب سے پہلے اس کے سرچشمہ پر منحصر ہے اور یہ کہ لوگ اس سرچشمہ سے کتنا تعلق رکھتے ہیں۔ اگر قانون اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ تو لوگوں کے دل ودماغ میں اس کی حیثیت اسی طرح کی ہوگی جیسے وہ نماز و زکوٰۃ کا جزء ہے۔

جو قانون یہاں تک پہنچا ہوا ہو اسی سے حالات مستحکم ہوسکتے ہیں۔

شریعت سب کے مفاد میں ہے کیونکہ اس کی بنیاد رحمت پر ہے اور اس کا مقصد لوگوں کو آخرت سے پہلے خود اس دنیا میں خوش بخت بنانا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جس بھلائی کا حکم دیا ہے ـــــ اور وہ بھلائی ہی کا

حکم دیتا ہے ـــــ دنیا میں اس کا فائدہ اور آخرت میں اس کا ثواب اس کے کرنے والوں ہی کو ملتا ہے۔ اور جس برائی سے اللہ نے روکا ہے ـــــ اور وہ برائی ہی سے روکتا ہے ـــــ وہ بندوں کو دور یا نزدیک اور ظاہری یا پوشیدہ تکلیف سے انھیں بچانے کے لیے ہی ہے۔

دین اور شریعت مخلوق پر خدا کی رحمت ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق سے کیا ضرورت پیش آسکتی ہے؟

کچھ لوگ شریعت کی سزاؤں کی سختی اور بے رحمی کی باتیں کرتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ ان سزاؤں کے ذریعہ ان لوگوں سے انتقام لینا اور اپنے دل کو سکون دینا چاہتا ہے جنھوں نے اس کے ساتھ کوئی برائی کی ہو۔

اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے کہیں زیادہ بالاتر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آسمانی سزائیں لوگوں کے لیے رحمت اور معاشرے کے لیے بھلائی کا ذریعہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ جب ایک قاتل کا خون بہانے کی ہدایت دیتا ہے تو اس لیے کہ ہزاروں جانیں بچ سکیں اور جب وہ ایک چور کا ہاتھ کاٹنے کی ہدایت دیتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ روئے زمین پر امن وامان کا بول بالا ہو۔

شاید دنیا میں اس سے بڑا جھوٹ کوئی نہیں ہوگا کہ سزائے موت کو منسوخ کرنے کے لیے انسانی جذبۂ ہمدردی کے نعرے لگائے جائیں۔

اس طرح کی بات مان لی جائے تو دنیا سے امن وانصاف ختم ہو جائے گا اور ہر جگہ سرکشی وانتشار پھیل جائے گا۔

شروع ہی سے انبیاء کی لائی ہوئی آسمانی شریعتیں دانشمندانہ رحمت کا تقاضا رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ اس نے بنی اسرائیل کے لیے پاک چیزیں جائز کی تھیں لیکن جب انھوں نے بغاوت اور جرائم پسندی کی راہ اختیار کی تو ان پر سختی کی گئی۔

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ

پھر اگر وہ تم کو جھٹلا دیں تو کہہ دو کہ تمہارے رب کی رحمت میں بڑی وسعت ہے اور گنہگار

اَلْمُجْرِمِیْنَ ۔ (الانعام ۔ ۱۴۷) لوگوں سے اس کا عذاب نہیں ٹلے گا۔

آسمانی قانون جب ایک مجرم کو پکڑتا ہے تو اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ پوری انسانی جماعت کو زندگی کا تحفظ اور امن وسکون فراہم کیا جائے۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔

اسی سبب سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھا کہ جو کوئی ایک جان کو، بلا کسی جان کے عوض یا بلا ملک میں فساد برپا کیے قتل کرے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا۔

(المائدة ۔ ۳۲)

جی ہاں! قتل پوری انسانیت کے خلاف جارحیت ہے اور اگر فیصلہ کن سزا کے ذریعہ اس کی روک تھام نہ ہوئی تو ایک ایک کر کے وہ نہ جانے کتنی جانوں کو نگل لے گی۔

وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِى الْاَلْبَابِ (البقرہ ۔ ۱۷۹) اور تمہارے لیے قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقلمندو!

زمین بارش ہو جانے سے سرسبز ہو جاتی ہے اور فصل دیتی ہے جس سے اناج، پھل اور سبزیاں وغیرہ حاصل ہوتی ہیں۔ یہ بارش کی برکت ہے۔

لیکن آسمانی سزاؤں کی برکت اس سے کہیں زیادہ اہم ہے جسے کچھ لوگ سمجھ نہیں پاتے۔ حدیث میں آتا ہے کہ:

"زمین پر کسی شرعی سزا کا نفاذ اہلِ زمین کے لیے اس سے زیادہ بہتر ہے کہ چالیس روز تک بارش ہو۔" (نسائی)

امن وانصاف کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے مزید ہوتا ہے:

"انصاف کرنے والے امام (حاکم) کا ایک دن ساٹھ برس کی عبادت سے بہتر ہے۔" (طبرانی)



شریعت کے احکام، اہلِ ایمان جن کے مکلّف بنائے گئے ہیں، ان کے لیے بیڑیوں کی حیثیت نہیں رکھتے۔ بلکہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی کی ضمانت ہیں۔

دین کو پریشان کن فرائض و اعمال کا مجموعہ سمجھنا غلط ہوگا۔

دین تو نظام اور چاق و چوبند رہنے کا نام ہے جو لوگ کاہلی یا انتشار سے مانوس ہیں وہ ان مطالب کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہ حق کے اقرار اور درجۂ کمال تک پہنچنے کی کوشش ہے۔ اگر کوئی شخص زمین میں درخت لگائے تو اس کی نشو و نما کے لیے توجہ درکار ہوتی ہے پھر نفس کی تربیت، فضائل کے سانچے میں ڈھالنے اور گھٹیا چیزوں سے اسے بچانے کے لیے توجہ اور محنت درکار نہیں ہوگی۔؟

پھر بھی اگر معاملہ مشقت و تنگی تک پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ اسے دور کرکے آسانی فراہم کر دیتا ہے۔

عزیمت کے کاموں کے ساتھ رخصت بھی ہے جسے پانی نہ مل سکے وہ تیمم کرلے جو سفر میں ہو نماز ہلکی کرلے، جو مریض ہو جائے وہ صحت مند ہونے کے بعد روزے رکھ لے جو پاکی کی حالت میں موزے پہن لے وہ سفر کی حالت میں تین روز تک ورنہ چوبیس گھنٹے تک، وضو کرتے وقت پاؤں دھونے کے بجائے صرف موزوں پر مسح کرلے۔

ضرورت کے وقت کچھ چیزیں وقتی طور پر مباح ہو جاتی ہیں۔

اگر کسی سے زبردستی کلمۂ کفر کہلوا دیا جائے تو اس سے مواخذہ نہیں ہوگا۔

اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۔ (النحل۔۱۰۶)	مگر وہ نہیں جس پر زبردستی کی گئی جبکہ اس کا دل ایمان پر برقرار رہے بلکہ وہ جو دل کھول کر منکر ہوئے ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔
فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (الانعام۔ ۱۴۵)	پھر جو کوئی مجبور کر دیا جائے، نافرمانی اور زیادتی نہ کرے تو تمہارا رب بڑا معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے۔

چونکہ ضرورت ممنوع چیزوں کو عارضی طور سے اور مجبوری میں مباح کرتی ہے دائمی اور اختیاری طور سے نہیں اس لیے جو لوگ اسلامی معاشرے میں سودی نظام کو ضرورت

کی بنیاد پر مباح قرار دیتے ہیں وہ بالکل غلطی پر ہیں کیونکہ وہ اس معاشرے کی بنیاد حرام پر قائم کر کے ایک حرام چیز کو دائمی طور پر حلال کرنا چاہتے ہیں۔

کائنات کے حقائق اور سائنسی اصولوں کی طرح شریعت کا اطلاق بھی عام ہے کسی علاقہ اور زمانے میں وہ تبدیل نہیں ہوا کرتی۔ جبکہ دنیاوی قانون مختلف قوموں اور ممالک کے درمیان بدلے ہوئے عُرف پر مبنی ہوتا ہے۔ خیر و شر کے کسی قابلِ احترام معیار کا لحاظ کیے بغیر۔

مغرب کا شہری قانون زنا کو جائز قرار دیتا ہے اگر وہ طرفین کی رضامندی سے ہو۔

اسی طرح وہ شراب نوشی کو جائز قرار دیتا ہے جب تک شراب کے نشے میں کوئی شخص سڑک پر ٹریفک میں خلل انداز نہ ہو۔

کچھ ممالک میں افیون و چرس کی کاشت کی اجازت ہے۔

گویا بھلائی یا برائی کے فائدے دنیاوی قانون میں بدلتے رہتے ہیں جبکہ شریعت میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔

کبھی عام زندگی کے کسی جزکی اصلاح سے متعلق قانون کامیاب بھی رہتا ہے مگر عام زندگی ایک مکمل اکائی ہے اس کے ایک جزکی اصلاح بقیہ حصّوں میں خلل سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ اسی لیے قانون سے جو مقاصد پورے نہیں ہوتے انھیں اخلاقی تعلیمات کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان کے خیال میں حقوق و فرائض اور اعلیٰ نمونہ کی تشریح کے ساتھ اخلاق اس اہم انسانی پہلو کی تکمیل کر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین سے الگ رہ کر علمِ اخلاق ریت کا مکان ہو جاتا ہے اور انسانی اقدار کی اصلاح میں قانون سے زیادہ کامیابی نہیں دکھاتا۔

اس لیے شریعت کا تقدس لوٹائے بغیر اور آسمانی احکام کو انسانوں کی فلاح و بہبود اور رہنمائی کا پرانا کردار ادا کرنے کا موقع دیے بغیر کوئی علاج ممکن نہیں۔



صدیوں تک اسلامی شریعت میں فقہی بحثیں انتہائی نمایاں مقام پر فائز رہی ہیں۔

ہمارے ہوشمند اسلاف نے اس میدان میں جو زبردست ورثہ چھوڑا ہے وہ ان کے گہرے علم، فکر و استدلال کی صحت و قوت اور قیاس و استنباط میں مہارت کا ثبوت ہے۔

پھر اس میں جمود آنے لگا اور تقلید کرنے والے علماء پیدا ہونے لگے۔ پھر اس تقلیدی علم کے ماہرین بھی ختم ہو گئے اور ایسے طوطے نمودار ہونے لگے جنھیں خود بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا رٹ لگا رہے ہیں۔ اسلامی فقہ گوشۂ گمنامی میں چلی گئی۔

دوسری طرف عام زندگی پر اس کا اثر یہ پڑا کہ وہ عقیدہ اور شریعت دونوں سے بیگانہ ہونے لگی۔

اب پھر قانون کے میدان میں استعمار کے خاتمہ کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے اور ماہرینِ قانون اسلامی شریعت کے عظیم سرچشموں کی طرف متوجہ ہونے لگے ہیں اور ان کے حسن و خوبی سے آگاہ ہونے لگے ہیں۔

سرکردہ شامی عیسائی ماہرِ قانون علامہ فارس الخوری کہتے ہیں:

"محمدؐ دنیا کی عظیم شخصیات میں سب سے عظیم شخصیت کے حامل تھے۔ دنیا کو ان جیسی کوئی اور شخصیت نہیں ملی۔ وہ جو دین لائے وہ سب سے مکمّل اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ دین ہے۔ اسلامی شریعت نے چار ہزار علمی، سماجی اور قانونی مسائل کا خزانہ چھوڑا ہے۔ انصاف پسند ماہرینِ قانون اسلامی شریعت کی فضیلت تسلیم کرنے اور یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اس کے اصول عقل کے ساتھ ہم آہنگ اور سائنسی حقائق اور انتہائی ترقی یافتہ نظاموں کے مطابق ہیں۔"

لبنانی عیسائی ماہرِ قانون پروفیسر سلیم باز لکھتے ہیں:

"میں پورے اطمینان کے ساتھ اپنے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ اسلامی فقہ انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہے یورپ کے ممالک اور مسلم علاقوں کی لائبریریوں میں موجود کتابیں اس بات کا بیّن ثبوت ہیں۔ اسلامی فقہ کے جو انسائیکلوپیڈیا ان لائبریریوں میں موجود ہیں وہ ہزاروں زبردست علماء کی جدّ و جہد کا نتیجہ ہیں۔ انصاف کے تقاضوں اور انسان کی ضرورتوں سے متعلق کوئی معاملہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں کسی مسلم فقیہ کا قول

موجود نہ ہو۔"

مشہور یورپین ماہر قانون سانتیلانا اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں:

"فقہ اسلامی میں وہ سب کچھ موجود ہے جو مسلمانوں کے شہری قوانین کے لیے کافی ہو، اگر ہم یہ نہ بھی تسلیم کریں کہ پوری انسانیت کے لیے کافی ہے۔"

ہارورڈ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہوکنگ اپنی کتاب "عالمی سیاست کی رُوح" میں لکھتے ہیں:

"میں اپنے آپ کو حق پر محسوس کرتا ہوں جب میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اسلامی شریعت میں وہ تمام اصول موجود ہیں جو ترقی کے لیے ضروری ہیں۔"

ڈاکٹر انریکو انسا باڈو کہتے ہیں:

"فقہ اسلامی بہت سی بحثوں میں یورپین قوانین پر فوقیت رکھتی ہے بلکہ وہ دنیا کو سب سے ٹھوس اور مستحکم شریعت دیتی ہے۔"

فرانسیسی پروفیسر لامبیر لکھتے ہیں:

"اسلامی شریعت میں موجود کتابوں کا لامتناہی ذخیرہ موجود ہے یہ ایسا چشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔ عہدِ وسطیٰ کی اسلامی شریعت اور اسلامی تہذیب کی تاریخ نے موجودہ عیسائی تہذیب کو بہت سارے عام اصول دیے ہیں۔"

جرمن ماہرِ قانون جوزف کوہلر ڈاکٹر محمود فتحی کی کتاب "فقہائے اسلام کے نزدیک حق کے استعمال میں "جبر" کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"جرمن اس بات پر بہت نازاں تھے کہ ۱۸۷۸ء کے شہری قانون میں انھوں نے پہلی بار "جبر" کا نظریہ ایجاد کیا لیکن اب یہ بات ظاہر ہوگئی ہے کہ فقہائے اسلام بہت پہلے آٹھویں صدی عیسوی ہی میں اس کے بارے میں کافی بحث کرچکے ہیں اب جرمنوں کو چاہیے کہ وہ اس نظریہ کے تعلق سے فخر کرنا ترک کردیں اور یہ اعزاز ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیں جنھوں نے جرمنوں سے دس صدیاں پہلے اسے جان لیا تھا۔ اور یہ تھے اسلامی شریعت کے علمبردار۔"

ویانا یونیورسٹی میں لارفیکلٹی کے ڈین پروفیسر سیرل نے ۱۹۲۷ء کے دوران حقوق سے متعلق

کانفرنس میں کہا تھا:

" انسانیت کو اس پر فخر ہے کہ محمدؐ جیسا کوئی شخص اس سے اپنی نسبت کرے، اَن پڑھ ہونے کے باوجود انھوں نے ایک ہزار برس سے بھی زیادہ پہلے ایسی شریعت پیش کی جس کی چوٹی تک ہم اہلِ یورپ اگر دو ہزار برس بعد بھی پہنچ جائیں تو انتہائی خوش نصیب ہوں گے۔"

۱۹۲۷ء کے دوران لاہائے میں قانون سے متعلق بین الاقوامی کانفرنس میں چوٹی کے ماہرینِ قانون اور جدید قانون کے ممتاز علماء اکٹھا ہوئے تو کانفرنس کو اسلامی شریعت کی فضیلت کا اعتراف کرنا پڑا اور یہ تسلیم کرنا پڑا کہ وہ ایک زندہ شریعت ہے جو تہذیب کے ساتھ قدم بقدم چل سکتی ہے اور زمانہ کی پیش رفت کا ساتھ دے سکتی ہے نیز یہ کہ موجودہ قانونی ماخذ میں اسے ممتاز جگہ دی جانی چاہیے۔

آخری بات

مسلمانوں کے حالات صدیوں سے خراب ہیں۔
ایک لمبی مدّت تک وہ دنیا کی بہترین قوم رہے۔
پھر ان کا پلّا کچھ ہلکا ہوا اور وہ دوسری قوموں کے برابر رہ گئے۔
پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ بہت سی قوموں سے پیچھے ہو گئے۔
یہ خام خیالی اور غلط فیصلہ ہوگا کہ ہم اس کی ذمّے داری اسلام پر ڈالیں۔
مسلمان بلندی کی چوٹیوں تک اس وقت پہنچے تھے جب اسلام کے ساتھ ان کا تعلّق مضبوط تھا۔ جب یہ تعلّق کمزور ہوگیا اور دونوں کے درمیان فاصلہ پیدا ہوگیا تو وہ دھیرے دھیرے پیچھے جانے لگے یہاں تک کہ جو لوگ ان سے منزلوں پیچھے تھے وہ منزلوں آگے نکل گئے۔

اس کے دو ہی اسباب ہیں:

۱۔ زندگی کے اہم میدانوں میں اسلامی ہدایات کو پوری وضاحت کے ساتھ نہ سمجھنا اور ان کی سنگین خلاف ورزی۔

۲۔ اسلامی حقائق کے اہم معانی و مطالب کو اس طرح الٹ پلٹ دینا کہ بہت سی بدعتیں اور اوہام و خرافات رائج ہو گئے۔ یہاں تک کہ متقیوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی اللہ کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کی کوشش ان طریقوں سے کرنے لگی جو اللہ تعالیٰ نے بنائے ہی نہیں تھے۔

صدیوں میں جو کچھ برباد ہوا ہے وہ برسوں اور مہینوں میں درست نہیں ہو سکتا اس کے لیے کافی لمبی مدت اور کافی طویل اور صبر آزما جدّ و جہد چاہیے۔

دین اپنے عروج کے دور میں دلوں کے نور، عمل کی درستگی، عہد و امانت کی پاسداری اور اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے ساتھ سچائی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ نئی نسلیں آتی ہیں تو وہ دین کو محض زبانی جمع خرچ کم ہمتی، ظاہرداری اور حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کا عنوان بنا لیتی ہیں۔

بسا اوقات دینی رسموں اور روایات کو دلوں کی بیماریوں اور ان کی خواہشات و مقاصد کی پردہ پوشی کا ذریعہ بنا لیا جاتا ہے۔

پہلی صورت میں دین اس کا حقدار ہوتا ہے کہ اس کا بول بالا ہو اور اس کی امت ترقی کرے۔ دوسری صورت میں زندگی فریب خوردہ اور فریب کار ظاہری دینداروں کا شکار ہو کر بلندی سے پستی اور کامیابی سے ناکامی کی طرف پہنچتی ہے۔

فیصلہ کن قانونِ الٰہی ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔	اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ نہ بدلیں جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔

(الرعد۔ ۱۱)

صورتِ حال کی اصلاح کے لیے ایک مدت ضروری ہے جس میں سنجیدگی پیدا ہو، ظلم حق سے، غدّاری وفاداری سے اور کند ذہنی ذہانت سے بدل جائے۔

کسی جاہل کو یہ سمجھانے کے لیے کہ وہ جہالت کا شکار ہے، ایک مدت چاہیے پھر اس جہالت کو ختم کرنے کی ضرورت کا قائل بنانے کے لیے ایک مدت چاہیے۔

پھر ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں پہنچنے کے لیے ایک مدت چاہیے۔

پھر ماضی سے ملے ہوئے شدید خوابِ غفلت اور امراض سے نجات پانے کے لیے ایک مدت چاہیے۔

اگر ایک پھل دار درخت کو لگانے، اسے پروان چڑھانے اور اس میں پھل آنے تک برسوں کا وقت لگتا ہے تو کسی شخص کی تربیت اور کسی قوم کو زندہ کرنے کے لیے ظاہر ہے بہت وقت چاہیے۔

لیکن سچے اور مخلص داعیوں کو یہ بوجھ اٹھانا ہی پڑتا ہے اور قوموں کے معمار بھاری بوجھ ہی اٹھاتے ہیں۔

کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کا یہ قول سنتے ہیں کہ:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي	کہو اے اللہ! سلطنت کے مالک تو جس کو
الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ	چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت
مِمَّنْ تَشَاءُ (آل عمران۔ ۲۶)	چھین لے۔

تو یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ مشیت الٰہی قوموں کی تقدیریں اچانک ہی بدل دیتی ہے۔

میں نے اس طرح کے ایک آدمی سے کہا: اس طرح کا بچکانہ طرزِ فکر چھوڑ دو۔

فلسطین میں ایک قوم سے اقتدار چھینا جانا اور دوسری قوم کے سپرد کیا جانا سو پچاس برسوں سے ہونے والی تیاریوں کا نتیجہ تھا۔ اب اگر کوئی قوم نقصان کے بعد فائدہ کی منزل تک پہنچنا اور اپنا ملک بحال کرنا چاہتی ہے تو پہلے اسے پوری باریک بینی سے چھان بین کرنی ہوگی کہ جو کچھ ہوا کن اسباب کی بنا پر ہوا، پھر کامیابی دلانے والے کاموں کے ذریعہ مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کی تیاری کرنی چاہیے اور اس سلسلہ میں پامردی اور مستقل مزاجی سے کام لینا بھی ناگزیر ہوگا۔

جوا کھیلنے والے تو بے سوچے سمجھے نفع نقصان کی بازی کھیل سکتے ہیں لیکن زندگی کے عملی میدان میں اس طرح کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔



ملّتِ اسلامیہ جتنی دین سے ناواقف ہے اتنی ہی دنیا سے بھی نابلد ہے۔ عالم غیب کے تعلق سے اسے جتنی بھول ہے اتنی ہی ظاہری دنیا کے تعلق سے بھی ہے۔

کوئی اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو کہ ملت کی ذہنی تھکاوٹ اور فقر و غربت کی وجہ

یہ ہے کہ وہ دنیا کے بجائے آخرت کی تعمیر میں مشغول ومنہمک ہے اور جنت کے حصول کی کوشش اسے دنیاوی زندگی کے لیے کوشش کی فرصت ہی نہیں دیتی۔

ناکامی کا شکار تو وہ دونوں میدانوں میں ہے۔ وہ اپنے پیغام کی ادائیگی ہی سے عاجز و درماندہ رہ گئی ہے۔ اسی لیے یہ ساری پسماندگی آئی اور مسلم ممالک استعمار کے شکنجوں میں پھنسے۔

ملت کو علم ومعرفت کی ایسی تیز موجوں کی ضرورت ہے جو اسے از سر نو زندہ کردیں اسے آسمان سے نازل ہونے والی اور زمین سے نکلنے والی ہر چیز کی پہچان کرادیں۔ علم کے تعلق سے اس کی پیاس اور تڑپ بہت شدید ہے۔ اگر علم ومعرفت کے سیلاب نے اسے سیراب نہ کیا تو وہ زندگی سے خالی ایک وحشت ناک صحرا میں تبدیل ہو کر رہ جائے گی۔

علم ہی کی طرح تربیت بھی ضروری ہے۔

علمی سطح کی بلندی اخلاق و کردار کی بلندی سے بے نیاز نہیں کرسکتی۔

علم انسانی عظمت کا حصہ اسی وقت بنے گا جب روشن ضمیری اور بامقصدیت کے ساتھ ہو۔ بدنیتی اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کے ساتھ علم بلندی کے بجائے پستی تک ہی پہنچا سکتا ہے۔

اسی لیے دین پہلے نفس کے تزکیہ اور اس کے رجحانات کی اصلاح چاہتا ہے تاکہ اس کے مضرت رساں پہلو ختم ہوجائیں۔

جب دین اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہوجائے گا تو وہ رہنمائی کرنے اور صحیح راستے پر بآسانی چلانے کے لائق ہوجائے گا۔

یہ عظیم مقصد حاصل کیسے ہو؟

بلند اخلاق و کردار، نظریاتی مطالعہ یا فوجی احکام سے تو تشکیل نہیں پاسکتے۔

یہ معاملہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ حکم دینے اور روکنے نیز ترغیب دینے اور ڈرانے کے ساتھ ماحول اور اس کے حالات کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔

یہ میرا تجربہ ہے کہ غربت و تنگی کا ماحول اخلاق و کردار کو پست اور کشادگی و بے نیازی

کا ماحول انھیں بلند بناتا ہے۔ اسی طرح ظلم واستبداد کا ماحول انھیں خراب کرتا ہے اور آزادی وعزت کا ماحول انھیں بہتر بناتا ہے۔

اخلاق وکردار جب تک کتابوں کے صفحات پر ہیں یا مقررین کی زبانوں پر خوشنما الفاظ کی صورت میں ہیں ان کی حیثیت وہی ہے جو بہترین خوبصورت شیشوں اور پیکنگ میں قیمتی دواؤں کی ہوتی ہے جب تک ان دواؤں کو پورے اہتمام سے استعمال نہ کیا جائے وہ فائدہ نہیں پہنچا سکتیں اسی طرح اخلاق وکردار کو انسانی وجود میں عملاً رچانا بسانا ناگزیر ہوتا ہے تاکہ زندگی پر ان کے اثرات مرتب ہوسکیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔	اور ہم قرآن میں سے اتارتے ہیں جس سے ایمان والوں کے روگ دفع ہوں اور ان کے لیے رحمت ہو۔

(بنی اسرائیل - ۸۲)

بلاشبہ قرآن مختلف انسانی امراض کے لیے شفا رکھتا ہے پھر وہ قومیں جو اس کتاب کی علمبردار ہیں کیونکر مختلف سنگین بیماریوں میں گرفتار ہیں؟ وجہ یہی ہے کہ انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ جس طرح پانی میں ڈبونے سے گلاس پانی سے بھر جاتا ہے اسی طرح بغیر کسی جدوجہد کے دلوں میں ایمان واحسان بھر جانا بھی ممکن ہے۔

خدا کی قسم یہ پاگل پن ہے، یہ ممکن ہی نہیں کہ ایمان اس طرح سے مکمل ہو یا حق اس طریقے سے باطل پر غالب ہوسکے۔

انسانی وجود میں جو صلاحیتیں موجود ہیں، ان کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح جسمانی ورزشوں سے نرم پٹھے طاقتور ہوتے ہیں اسی طرح داخلی صلاحیتوں کا بھی حال ہے۔

مثلاً ابتدائی طور پر انسان کی فکری صلاحیت معمولی ہوتی ہے پھر سازگار ماحول میں حیرت ناک تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرتی ہے شروع میں متاثر زیادہ ہوتی ہے خود اثرانداز نہیں ہوتی۔ پھر اس پر توجہ مرکوز رکھنے اور مشق سے مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہاں تک کہ جو شخص غور و خوض میں لگا رہتا ہے اس کی فکری شخصیت مکمل ہو جاتی ہے اور صاحبِ فکر بن جاتا ہے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ عام آدمی رہ جاتا ہے۔

یہی حال تمام انسانی صلاحیتوں کا ہے یہاں تک کہ جسمانی ضرورتوں کا بھی۔ اگر انسان انھیں دبانے کی کوشش کرے تو وہ دھیرے دھیرے ماند پڑتی چلی جاتی ہیں اور اگر ان کی حوصلہ افزائی کرے اور اس کی خصوصی مشق کرتا رہے تو وہ طاقتور ہوتی چلی جاتی ہیں اور آگ کی طرح انسان پر چھا جاتی ہیں اور اس کی حیا و پاکیزگی کو ختم کر دیتی ہیں۔ یہی انسانی فطرت کے تعلق سے دین کا حال بھی ہے وہ انسان کے اندر موجود ہوتا ہے لیکن ابتدائی طور پر کمزور ہوتا ہے اسے پروان چڑھانے کے لیے اپنے طرز کی مشق کی ضرورت ہوتی ہے جو اس میں زندگی، طاقت اور گرمی پیدا کرے یہاں تک کہ خواہشات و رجحانات پر غالب آجائے اور اس میں خود زندگی سے زیادہ گہرائی و وسعت پیدا ہو جائے دین کے لیے مشق کا ذریعہ عبادات ہیں اور ان کا طریقہ اور کیفیت ہمیں اللہ تعالیٰ سے ملی ہے۔

جب دین ــــ جو تمام فضائل کی جڑ ہے ــــ کے پودے کو اس طرح نشو و نما کی ضرورت پڑتی ہے تو اخلاق و کردار کے ایک ایک پہلو کی نشو و نما کے لیے کیوں نہ ضرورت ہوگی۔؟

معاملہ لمبی مشق اور باقاعدہ علاج چاہتا ہے۔
اور جدّ و جہد کے لیے صحیح طریقہ کار اور صحیح رخ بھی ناگزیر ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب کے لیے

تصنیف
سید حامد محسن

ترجمہ
ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

تصحیح وتخریج
ابوعبداللہ محمد

مکتبہ قاسم العلوم

نضر الله امرأ سمع منا حديثا فبلغه (حديث)

تذکرۃ المحدثین

حصہ دوم

اس میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری
کے اکثر مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات وسوانح
اور ان کی علمی وحدیثی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

ضیاء الدین اصلاحی

مکتبہ قاسم العلوم